جلد ۱۱ - شمار - ۲

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

فہرست مضامین فروری سنہ ۱۹۲۷ء

ملاحظات	اڈیٹر	۲
آغاز ہستی (ڈراما)	مجنوں گورکھپوری	۵
شمالی ہند اور دکن	مسٹر سعیدی بی۔ اے	۱۷
جانعالم اور ملکۂ مہر نگار (فسانہ)	اڈیٹر	۲۶
نظامی عروضی اور چہار مقالہ	مسٹر سید محمد بی۔ اے	۳۸
درس محبت (فسانہ)	اڈیٹر	۴۸
انتساب حیات (نظم)	سعید رزمی	۵۶
فلسفۂ محبت	ابوالنظر رضوی	۵۷
بندگی شکم (نظم)	نظیر لودھیانوی	۶۸
تاج آگرہ	سید اعجاز ساندوی	۷۰
شاعر اور تتلی (نظم)	شہاب برنی	۷۷
ایک گم گشتہ کی یاد (نظم)	حسام الدین کاکوروی	۷۸
سیاحت ماہتاب	مسٹر ورما بیتاب	۷۹
آرزوئے معصوم (نظم)	امین حزیں	۸۲
موج تسنیم (نظم)	سید سرفراز حسین بی اے	۸۳
ظہیر الدین محمد بابر	سید عبد السبحان ناظر	۸۰
فکاہات	ملا رموزی	۸۹
معلومات	اڈیٹر	۹۴-۹۶

نگار مشین پریس لکھنؤ میں باہتمام وصل بلگرامی چھپا

اور

منیجر نگار نے بھوپال سے شائع کیا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی تیار کردہ اشیاء خالص عمدہ و بکفایت ہوتی ہیں

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر نیاز فتحپوری

شمار ۲	فروری سنہ ۱۹۲۷ء	جلد ۱۱

ملاحظات

کچھ حصہ دسمبر کا اور جنوری کا پورا مہینہ میرے لئے سخت مصروفیت میں بسر ہوا اور مسلسل سفر میں رہنا پڑا چنانچہ اسی بنا پر باب استفسارات اس مہینہ میں مستقل حذف کرنا پڑا اور احباب کے خطوط کا جواب بروقت نہ دے سکا۔

غالباً یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ مدیر نگار اور مدیر مرقع جناب فضل بلگرامی کی باہمی مساوی مشارکت سے جدید مطبع، نگار شین پریس کے نام سے قائم ہو گیا ہے جو بجلی کی قوت سے چلنے والا ہے اور اس ماہ کا رسالہ اسی پریس میں طبع ہو رہا ہے

اب آپ نگار کی امداد اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ آپ کو یا آپ کے احباب میں سے اگر کسی کو کبھی کوئی کتاب یا رسالہ طبع کرانا ہو تو سب سے پہلے نگار شین پریس کو اس خدمت کے لئے تجویز فرمائیں۔

جنوری کے نگار میں جناب چغتائی کی جو تصاویر شائع ہوئی ہیں، اُن کے متعلق مجھے نہایت صفائی سے ظاہر کر دینا چاہئے کہ نگار کے حلقہ میں ایک شخص نے بھی انھیں پسند نہیں کیا اور خصوصیت کے ساتھ تصویر اسیری پر تو بری طرح لعن طعن کیا گیا ہے

میں نے جناب چغتائی سے درخواست کی تھی کہ جب وہ کوئی تصویر مرحمت فرمائیں تو پہلے اس کی ایک کاپی دیکھنے کے لئے بھیجدیں

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

لیکن انھوں نے (غالباً اپنے فن کی تکمیل پر اعتماد کرتے ہوئے) اس کی ضرورت نہیں سمجھی اور بغیر کسی اطلاع کے دونوں تصویریں چھپوا کر بھجدیں۔ یقیناً یہ تصویریں مجھے پسند نہ تھیں۔ (جس کا سبب شاید میری بد ذوقی ہو) لیکن چونکہ انھوں نے میرے ہی خواہش پر تصویریں روانہ فرمائی تھیں اس لئے میں نے واپس کرنا مناسب نہ سمجھا اور ان کو لکھا کہ کم از کم ان نقوش کے محاسن پر فن کے نقطۂ نظر سے کچھ لکھدیں، لیکن اُن کو شاید عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ ملا

بہرحال ایک طرف میں جناب چغتائی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے نقوش نگار کو مرحمت فرمائے تو دوسری طرف میں ناظرین نگار سے معذرت خواہ ہوں کہ کوئی نقش ان کے "درخور ذوق" نہ پیش نہ کر سکا۔ لیکن آئندہ کے لئے عہد کرتا ہوں کہ کبھی کوئی تصویر ایسی پیش نہ کروں گا جس میں حسن، فن سے مغلوب ہو کر مسخ ہو گیا ہو۔

اس ماہ کے جدید مضامین میں جناب سید محمد صاحب بی اے کا مضمون چہار مقالہ پر نہایت خوب ہے ابوالنظر صاحب رضوی نے فلسفۂ محبت کے عنوان سے جناب اثر لکھنوی کی تنقید سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے نظریہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے تاج آگرہ پر اعجاز صاحب کا مضمون بھی دلچپی سے پڑھے جانے کے قابل ہے

جان عالم اور ملکۂ مہر نگار۔ اور درس محبت میرے دو افسانے ہیں جن میں سے اول الذکر میں صرف لفظ (Sensualism) کی وہ عملی تشریح کی گئی ہے جس پر آج کل یورپ کی ذہنیت فریفتہ نظر آتی ہے اور دوسرے فسانہ میں تعلق ازدواج کے صحیح روح کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ فسانہ میں نے جناب جلیل بلگرامی کے اصرار پر لکھا اور جنوری کے مرقع میں وہ شایع بھی کر چکے ہیں۔

منظومات میں ہر نظم اپنی جگہ داد طلب ہے

سنہ ۱۹۲۶ء اپنی آخری گھڑیاں طے کر رہا تھا کہ شرر لکھنوی ہم سے جدا ہوئے اور سنہ ۱۹۲۷ء نے اپنے چہرہ سے نقاب الٹا ہی تھا کہ شاد عظیم آبادی نے منہ موڑ لیا۔ ہر چند یہ دونوں حضرات اپنی عمر طبعی کو پہونچ چکے تھے، لیکن اس کا کیا علاج کہ ابھی ملک ان میں کسی کی بھی جدائی گوارا کرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ اب خواہ ان کے فقدان پر کتنا ہی ماتم کیا جائے، کتنی ہی یادگاریں قائم کیجائیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ اب نہ کوئی دوسرا شرر پیدا ہوگا نہ شاد۔

تنگی وقت کی وجہ سے اس مرتبہ باب استفسارات پر توجہ نہیں کر سکا۔ آئندہ مہینے ارادہ ہے کہ ولادت و وفات مسیح کے متعلق جو مضامین میری مخالفت میں آئے ہیں ان میں سے خاص خاص کو درج کر کے ان کا جواب دیدیا جائے اور پھر اس قصہ کو ختم کر دیا جائے کہ مسیح سے

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگوائیے

زیادہ خود اپنی ہی حالات و معاملات زیادہ تحقیق و توجہ کے مستحق ہیں ۔

نقاب اٹھ جانے کے بعد کا سلسلہ بعض حضرات نے پسند کیا اور بعض نے ناپسند، اس پسندیدگی اور عدم پسندیدگی کا نتیجہ اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن کم از کم یہ حقیقت ضرور مجھ پر منکشف ہو گئی کہ حلقۂ نگار میں سے کتنے ہیں جو خرقہ پوشان مکر و سالوس کے زخم خوردہ ہیں ۔ اس سلسلہ کی تیسری کڑی بھی تقریباً طیار ہو چکی ہے اور غالباً مارچ میں شائع ہو گی، یقیناً نہیں ۔

آئندہ مضامین کی فہرست پہلے سے شائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ بسا اوقات مجھے بعض مضامین دوبارہ غور کرنے کے وقت نکال دینے پڑتے ہیں ۔ لیکن یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ماہ مستقبل سے کپتان ڈائل کے بعض نہایت ہی دلچسپ فسانوں کا ترجمہ مستقلاً شائع ہوتا رہیگا ۔ اور میرا ایک فسانہ جس کا تعلق بالکل انشاء عالیہ سے ہے وہ بھی آئندہ مہینے میں درج نگار ہوگا

بعض حضرات ملک میں ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کا محبوب ترین شغلہ آپس میں جنگ کرا دینا ہے (چنانچہ مجھے اور معزز معاصر نیرنگ خیال کے اڈیٹر کو اس کا تجربہ ہو چکا ہے) اس لئے میں تمام ان حضرات کو جن کا تعلق صحافت سے ہے بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر ان کے پاس کوئی تحریر ایسی آئے جس میں کسی دوسرے صحافی کی طرف سے بدظن کرنے کی کوشش کی گئی ہو تو اُس کو دیکھ کر جلد فیصلہ نہ کریں بلکہ کافی تحقیق کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچیں ۔

وہ حضرات جن کے مضامین دسمبر تک موصول ہو چکے ہیں، انھیں مطمئن رہنا چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ مارچ اپریل تک انتظار کرنا پڑیگا اسی طرح مستفسرین کی خدمت میں بھی التماس ہے کہ وہ مضطرب نہ ہوں ۔ انشاء اللہ بہت جلد ان کے استفسارات کو بھی طے کئے دیتا ہوں چونکہ یہ زمانہ بعض اہم ضرورتوں کی وجہ سے برابر سفر میں گزرا اور شاید ابھی ایک مہینہ اور اسی الجھن میں بسر ہو اس لئے اگر رسالہ کی ترتیب سے کہیں میری بے اطمینانی کا پتہ چلے تو اُس کو بے سبب نہ سمجھیں

اکثر احباب میری اہلیہ کی بیماری کی وجہ سے متردد تھے اور مجھ سے ازراہ خلوص و محبت دریافت کیا کرتے تھے اس لئے اُن کی اطلاع کے لئے مجھ پر یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ بحمد اللہ وہ کلیتہً "استرداد صحت" کر چکی ہیں اور میں اب انکی طرف سے بالکل مطمئن ہوں ۔

نیاز فتحپوری

تمام ماہران فن نے اصغر علی محمد علی تاجران عطر حنا کو بہترین عطر مانا ہے

آغازِ ہستی

(۲)

بہ سلسلۂ ماسبق

چند صدیوں کے بعد۔ صبح کا وقت عراق عرب مین ایک نخلستان اور یہیں لٹھوں سے بنا ہوا ایک مکان ہے جو ایک پائیں باغ پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ آدم وسط باغ مین زمین کھود رہا ہے اُس کے داہنی جانب جو دروازے کے پاس ایک درخت کے سائے مین تپائی پر بیٹھی ہوئی کات رہی ہے اس کا چرخہ جس کو وہ ہاتھ سے چلا رہی ہے ایک بڑے پہیے کی طرح ہے جو وزنی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ باغ کی دوسری جانب کانٹوں کی ایک دیوار ہے جس مین ٹٹی سے بند ایک راستہ ہے۔

دونوں کفایت اور بے پروائی کے ساتھ موٹے کپڑوں اور پتوں مین ملبوس ہین۔ دونوں اپنا بچپن اور معصومیت کھو چکے ہیں آدم کی داڑھی بڑھی ہوئی ہے اور اُس کے بال بے قاعدہ کٹے ہوئے ہیں لیکن دونوں تندرست ہین اور شباب کے عالم میں ہیں آدم ایک کسان کی طرح تھکا ہوا نظر آتا ہے حوا نسبتاً زیادہ خوش ہے۔ وہ بیٹھی کات رہی ہے اور کچھ سوچ رہی ہے۔

ایک مرد کی آواز:۔

اہا۔ ماں!

حوا (نظر اُٹھا کر سامنے ٹٹی کی طرف دیکھتی ہے) قابیل آرہا ہے۔

آدم (حقارت کا اظہار کرتا ہے اور بغیر سر اُٹھائے ہوئے زمین کھودنے مین مصروف رہتا ہے)

قابیل ٹٹی کو ٹھکرا کر راستہ سے الگ کر دیتا ہے۔ اور لمبے لمبے قدموں سے باغ مین داخل ہوتا ہے۔ لب و لہجہ اور وضع و قطع سے وہ ایک ضدی سپاہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک لمبے نیزے اور چمڑے کی ایک چوڑی ڈھال سے مسلح ہے۔ ڈھال پر پیتل منڈھا ہوا ہے اُس کی خود شیر کے سر سے بنائی گئی ہے جس مین بیل کی سینگین لگی ہوئی ہین۔ وہ سُرخ لبادہ پہنے ہوئے ہے اور ایک تمغہ لگائے ہوئے ہے تمغہ شیر کے چمڑے پر ٹنکا ہوا ہے جس مین شیر کے ناخون لٹک رہے ہیں۔ پانوں میں کھڑاؤں ہیں جن پر پیتل کے کام بنے ہوئے ہیں۔ اس کی ٹانگیں پیتل کے غلاف سے محفوظ ہیں اور اُس کی کھڑی فوجی مونچھیں تیل سے چمک رہی ہیں۔ والدین کے ساتھ اُس کا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا عطر بہت مشہور ہے

برتاؤ ایسا ہے جس سے اُس کی خود سری اور نافرمانی کا پتہ چلتا ہے وہ جانتا ہے کہ اُس کے اطوار پسندیدہ نہیں ہیں اور نہ وہ معاف کیا گیا ہے ،

قابیل - (آدم سے) ابھی تک زمین کھودنا ختم نہیں ہوا؟ تم ہمیشہ زمین کھودتے رہوگے اور اسی پُرانی نالی میں لگے رہوگے کوئی ترقی نہیں! کوئی نیا خیال نہیں کوئی کارنامہ نہیں! اگر میں بھی اسی زمین کھودنے میں لگا رہتا جیسا کہ تم نے مجھے سکھایا تھا تو آج میں کچھ نہ ہوتا۔

آدم - تم نیزہ اور ڈھال لیے ہوئے اس وقت کیا ہو؟ جب کہ تمھارے بھائی کا خون زمین کے اندر سے تمھارے خلاف فریاد کر رہا ہے۔

قابیل - میں پہلا قاتل ہوں - تم محض پہلے انسان ہو - ہر شخص پہلا انسان ہو سکتا تھا - یہ ایسا ہی آسان ہے جیسا کہ پہلی گوبھی ہونا - لیکن پہلا قاتل ہونے کے لیے ہمت کے آدمی کی ضرورت ہے۔

آدم - یہاں سے چلے جاؤ - ہمارا پیچھا چھوڑدو - ہم کو جدا رکھنے کے لیے دنیا بہت وسیع ہے۔

حوّا - تم اُس کو کیوں بھگاتے ہو - وہ میرا ہے میں نے اُس کو اپنے جسم سے بنایا تھا - میں اپنی بنائی ہوئی چیز کو کبھی کبھی دیکھنا چاہتی ہوں۔

آدم - تم نے تو ہابیل کو بھی بنایا تھا - اس نے ہابیل کو مار ڈالا اسپر بھی کیا تم اُس کو دیکھنے کی روادار ہو سکتی ہو؟

قابیل - میں نے ہابیل کو مار ڈالا تو یہ کس کا تصور تھا؟ مار ڈالنا کس نے ایجاد کیا تھا؟ میں نے؟ نہیں اُسی نے ایجاد کیا تھا - میں تو تمھاری تعلیم پر چل رہا تھا - میں تو زمین کھودا کرتا تھا - اور خار و خس صاف کیا کرتا تھا - میں زمین کا پھل کھاتا تھا - اور تمھاری طرح محنت کے پسینہ سے زندگی بسر کرتا تھا - میں بیوقوف تھا - لیکن ہابیل نئے خیالات اور ہمت کا آدمی تھا - وہ محقق تھا اور واقعی ترقی کرنے والا تھا - اس نے خون کو دریافت کیا اور قتل ایجاد کیا - اُس نے یہ معلوم کیا کہ سورج کی آگ شبنم کے قطرہ کے ذریعہ سے نیچے لائی جا سکتی ہے۔ اُس نے آگ کو ہمیشہ روشن رکھنے کے لیے ایک قربانگاہ تیار کی - جتنے جانور مارتا تھا اُن کے گوشت کو قربان گاہ میں آگ سے پکاتا تھا - وہ اپنے کو گوشت کھا کھا کر زندہ رکھتا تھا - اُس کو اپنی غذا حاصل کرنے کے لیے صرف اس کی ضرورت تھی کہ اپنا دن شکار جیسے صحت بخش اور مہتم بالشان مشغلہ میں صرف کرے اور پھر ایک گھنٹہ آگ کے ساتھ کھیل کرے - تم نے اُس سے کچھ بھی نہیں سیکھا - تم مشقت کرتے رہے اور مجھ سے بھی یہی کام کراتے رہے - میں ہابیل کی مسرت اور آزادی پر رشک کرتا تھا میں اپنے کو اس لیے حقیر سمجھتا تھا کہ بجائے تمھاری تقلید کرنے کے اُس کی تقلید نہیں کرتا ہے۔ وہ اسقدر خوش نصیب تھا کہ اپنے کھانے میں اُس "آواز" کو بھی شریک کرتا تھا - جس نے اُس کو تمام نئی باتیں بتائی تھیں - وہ کہتا تھا " یہ آواز اُس آگ کی آواز ہے جو میرا کھانا پکاتی ہے - اور جو آگ کھانا پکا سکتی ہے وہ کھا بھی سکتی ہے " یہ سچ تھا میں نے آگ کو قربان گاہ میں

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

کھانے کو ختم کر دیتے ہوئے خود دیکھا تب میں نے بھی ایک قربان گاہ بنائی اور اُسپر کھانے کی بھینٹ چڑھائی۔ غلے جڑیں اور میوے۔ سب بیکار۔ کچھ نہ ہوا۔ ہابیل مجھ پر ہنستا تھا اور تب ایک بڑی بات میں نے سوچی۔ کیوں نہ ہابیل کو مار ڈالو جس طرح وہ جانوروں کو مارا کرتا تھا؟ میں نے وار کیا اور وہ مر گیا جس طرح جانور مرا کرتے تھے اس کے بعد میں نے تمھاری حماقت اور مشقت کی زندگی کو چھوڑ دیا اور اُس کی طرح بسر کرنے لگا شکار۔ خونریزی اور شکار کے ذریعہ سے۔ کیا میں تم سے بہتر۔ تم سے زیادہ توانا۔ تم سے زیادہ خوش اور تم سے زیادہ آزاد نہیں ہوں؟

آدم۔ تم زیادہ توانا نہیں ہو۔ تم تو پست قد ہو۔ تمھاری زندگی پائدار ہو نہیں سکتی۔ تم نے جانوروں کو اپنے سے خوفزدہ کر دیا سانپ نے اپنے کو تم سے بچانے کے لیے زہر پیدا کر لیا ہے میں خود تم سے ڈرتا ہوں۔ اگر تم اپنی ماں کی طرف ایک قدم اور بڑھے تو میں اپنے کُلند سے تم کو اُسی طرح مار کر گرا دوں گا۔ جس طرح تم نے ہابیل کو مار کر گرا دیا تھا۔

حوّا۔ وہ مجھکو مارے گا نہیں۔ وہ میری محبت کرتا ہے۔

آدم۔ وہ ہابیل کی بھی محبت کرتا تھا مگر اُس کو اس نے مار ڈالا۔

قابیل۔ میں عورتوں کو مارنا نہیں چاہتا۔ میں اپنی ماں کو نہیں ماروں گا اور اُسی کے خیال سے تم کو بھی نہیں ماروں گا۔ اگرچہ بغیر تمھارے کُلند کی زد میں آئے ہوئے اس نیزے کو تمھارے پار کر سکتا ہوں۔ مجھے یہ خیال نہ ہوتا۔ تو میں تم کو مار ڈالنے کی کوشش کیے بغیر نہ رہتا اگرچہ ڈرتا ہوں کہ کہیں تم نہ مجکو مار ڈالو۔ میں نے شیر اور جنگلی سور سے زور آزمائی کی ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ کون کس کو مار ڈالتا ہے۔ میں نے انسان کے ساتھ بھی زور آزمائی کی ہے۔ نیزہ بہ نیزہ اور سپر بہ سپر یہ ہے تو خوفناک کام اس سے زیادہ لطف بھی کسی اور کام میں نہیں۔ میں اسکو لڑائی کہتا ہوں۔ جو کبھی لڑا نہیں وہ زندگی کا مزہ نہیں جانتا۔ یہی غرض مجھکو ماں کے پاس آئی ہے

آدم۔ اب تمکو ایک دوسرے سے کیا مطلب؟ وہ پیدا کرنیوالی ہے اور تم فنا کرنے والے ہو۔

قابیل۔ میں فنا کیسے کر سکتا ہوں تاوقتیکہ وہ پیدا نہ کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اور مرد پیدا کرتی رہے اور ہاں عورتیں بھی تاکہ وہ جب اپنی اپنی باری اور زیادہ مرد پیدا کریں۔ بے شمار مردوں کی جتنی کہ ہزار درختوں پر پتیاں ہوں گی اُن سے بھی زیادہ مردوں کی ایک عظیم الشان نظم کا تصور میرے ذہن میں ہے۔ میں اُن کو دو بڑے فرقوں میں تقسیم کروں گا ایک کا سردار میں بنونگا دوسرے کا وہ شخص جس سے میں سب سے زیادہ ڈروں اور جسکو سب سے پہلے مار ڈالنا چاہوں۔ ذرا سوچو تو انسان کی یہ تمام جماعتیں آپس میں لڑتی مرتی ہوں گی۔ فتح کی پکار! جوش کے نعرے! مایوسی کو سننے! دکھ کی فریاد! یہ البتہ زندگی ہو گی ایسی زندگی جو پوری طرح کام میں لائی گئی ہو ایک دہکتی ہوئی اور طوفانی زندگی! جس نے اس کو نہ دیکھا ہو گا۔ نہ سُنا ہو گا۔ نہ محسوس کیا ہو گا۔ اور نہ آزمایا ہو گا۔ وہ اس آدمی کے سامنے جس نے یہ سب کچھ کیا ہو گا اپنے کو ناچیز اور بیوقوف سمجھے گا۔

حوّا۔ اور میں! میں صرف ایک آسان ذریعہ ہونگی مردوں کو پیدا کرنیکا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر کا حنا بہت مشہور ہے۔

تاکہ تم انکو مار ڈالو۔

آدم۔ یا وہ تم کو مار ڈالیں۔

قابیل۔ ماں مردوں کو پیدا کرنا تمھارا حق ہے۔ تمھارا کام ہے تمھاری تکلیف ہی تمھارا وقار ہے اور تمھاری فتح ہے تم میرے باپ کو جیسا کہ تم کہتی ہو اسکے لیے محض اپنا ایک ذریعہ بنا لیتی ہو۔ اُسکو تمھارے لیے زمین کھودنی پڑتی ہے۔ مشقت کرنی پڑتی ہے چلنا پڑتا ہے۔ بالکل اُس بیل کی طرح جو زمین پھاڑنے میں اُس کو مدد دیتا ہے یا اُس گدھے کی طرح جو اُسکی بار برداری کرتا ہے۔ کوئی عورت مجھ سے میرے باپ کی زندگی نہیں بسر کرا سکتی۔ میں شکار کرونگا۔ لڑونگا اور اپنی رگ رگ کی قوت صرف کرونگا جب اپنی جان خطرہ میں ڈالکر جنگلی سور مار کر لاؤنگا تو میں اپنی عورت کے آگے لاکر ڈالدونگا کہ وہ اُسکو پکالے۔ اور اُس کی محنتوں کے صلہ میں اُس کو بھی ایک لقمہ دیدونگا۔ اُس کو کوئی دوسری غذا نہیں ملیگی۔ اس سے وہ میری کنیز ہو جائیگی اور جو مجھکو مار ڈالیگا وہ اس عورت کو بحیثیت مال غنیمت کے لیجائیگا۔ مرد عورت کا مالک ہوگا نہ کہ اُسکا بچہ اور فرزند

(آدم اپنا کلند پھینکدیتا ہے اور غور سے حوّا کو دیکھنے لگتا ہے)

حوّا۔ آدم کیا تم آزمایش میں پڑ گئے؟ کیا ہماری آپس کی محبت سے تم کو یہ بات بہتر معلوم ہوتی ہے؟

قابیل۔ محبت کا حال وہ کیا جانے؟ جب وہ لڑ چکے گا تب خطرہ اور موت کا مقابلہ کریگا جب وہ اپنی قوت کا آخری جوش صرف کرکے جد وجہد کر چکے گا۔ اُسیوقت اُس کو معلوم ہوگا کہ درحقیقت عورت کی آغوش میں محبت سے سکون حاصل کرنا کس کو کہتے ہیں اُس عورت سے پوچھو جس کو تم نے پیدا کیا ہے اور جو میری بیوی ہے کیا وہ میری اگلی روش پسند کریگی جبکہ میں آدم کی پیروی کرتا تھا اور کھیتی اور مزدوری کرتا تھا؟

حوّا۔ (غصہ میں چرخہ چھوڑکر) تمھارا منھ کہ یہاں آکر لعا[۱] پر ناز کرو جو کسی کام کی نہیں اور جو بدترین لڑکی اور بدترین بیوی ہے! تم اُس کے مالک ہو! تم تو آدم کے بیل یا اپنے رکھوال کتے سے بھی کہیں زیادہ اُس کے غلام ہو۔ بیشک جب تم اپنی جان خطرہ میں ڈالکر جنگلی سور کا شکار کروگے تو اُس کی محنتوں کے صلہ میں ایک لقمہ اُس کے آگے بھی ڈالدوگے! ہاہاہا! کمبخت کیا یہ سمجھتے ہو کہ میں اُس سے یا اُس سے زیادہ تم سے واقف نہیں ہوں؟ کیا تمھاری جان اُسوقت بھی خطرہ میں ہوتی ہے۔ جب تم گلہری یا نیلی لومڑی کو مارتے ہو تاکہ وہ اُنکو اپنے جسم سے لٹکاکر عورت سے جانور بنجائے؟ جب تم بے بس اور کمزور چڑیوں کو جال میں پھنساتے ہو صرف اس لیے کہ لعا کو معمولی اور حلال غذا کھانے میں تکلیف ہوتی ہے تو اُسوقت کیسے سورما معلوم ہوتے ہو؟ تم شیر کو مارنے کیلیے ضرور اپنی جان خطرہ میں ڈالتے ہو لیکن اُسکا چمڑا اسکو ملتا ہے جس کے لیے تم نے خطرہ کا سامنا کیا؟ لعا اُسکو اپنا بچھونا بنانے کیواسطے لے لیتی ہے اور اُس کا سڑا ہوا گوشت تمھارے آگے پھینک دیتی ہے جسکو تم کھا بھی نہیں سکتے۔ تم لڑتے ہو اس لیے کہ سمجھتے ہو وہ اس سے تمھاری قدر کرتی ہے اور تم کو چاہتی ہے۔ احمق! وہ تم کو اس غرض سے لڑاتی ہے کہ تم اُس کو سامان آرائش اور مقتولوں کا مال لاکر دیتے ہو اور وہ لوگ جو تم سے ڈرتے ہیں اُسکو سونا چاندی اور دولت

۱؎ بائرن نے اپنے ڈرامہ "قابیل" میں قابیل کی بیوی کا نام عادہ بتایا ہے۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عمدہ عطر ملتا ہے

دیتے رہتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ میں آدم کو محض ایک ذریعہ بنائے ہوئے ہوں! میں جو چرخہ چلاتی ہوں اور گھر کی نگرانی کرتی ہوں اولاد پیدا کرتی ہوں اور اُن کی پرورش کرتی ہوں! میں جو ایک عورت ہوں اور مردوں کو لبھانے اور انکا شکار کرنے کیلیے کوئی بلا یا جانور نہیں ہوں! تم کیا ہو؟ ایک بدبخت غلام جو چہرہ پر ملمع کیے ہو یا جانوروں کے سمور کی ایک گٹھری۔ جب میں نے پیدا کیا تھا تو تم ایک انسان کے بچے تھے اور لعا ایک انسان کی بچی تم لوگوں نے اب اپنے کو کیا بنا ڈالا ہے؟

قابیل۔ (نیزے کو ڈھال میں پہنا کر موچھوں کو اینٹھتا ہوا) انسان سے بالاتر بھی کوئی چیز ہے "بطل" اور "فوق الانسان"

حوّا۔ فوق الانسان! تم فوق الانسان نہیں ہو۔ تم تو تحت الانسان ہو تمھارا اور مردوں کے ساتھ وہی تعلق ہے جو سفید لومڑی کا خرگوش کے ساتھ ہے اور لعا کا تمھارے ساتھ وہ تعلق ہے جو جونک کا سفید لومڑی کے ساتھ ہے۔ تم اپنے باپ کو حقیر سمجھتے ہو۔ لیکن جب وہ مریگا تو دنیا اُس کی زندگی کی وجہ سے زیادہ معمور ہو چکی ہوگی جب تم مروگے تو لوگ کہیں گے "وہ بڑا جنگجو تھا" لیکن دُنیا کے لیے یہ بہتر ہوتا کہ وہ پیدا نہ ہوا ہوتا اور لعا کے بارے میں وہ کچھ نہ کہیں گے بلکہ جب اُسکو یاد کریں گے تو اُسکے نام پر تھوک دینگے

قابیل۔ وہ ساتھ رکھنے کے لیے تم سے بہتر عورت ہے۔ اور اگر وہ بھی مجھکو اُسی طرح ملامت کرتی جس طرح تم کر رہی ہو۔ یا جس طرح آدم کو ملامت کیا کرتی ہو تو میں اُسکو مارتے مارتے نیلا کر دیتا میں نے ایسا کیا بھی ہے۔ اور تم کہتی ہو کہ میں غلام ہوں۔

حوّا۔ اس لیے کہ اُس نے دوسرے مرد پر نگاہ ڈالی تھی۔ اور تم اُس کے قدموں پر گرے اور رو رو کر معافی مانگنے لگے اور پہلے سے دس گنا اُس کے غلام ہو گئے اور وہ جب خوب کراہ چکی اور اُس کا درد کم ہوا تو اُس نے تمکو معاف کر دیا۔ کیوں سچ ہے کہ نہیں؟

قابیل۔ وہ مجھ سے پہلے سے زیادہ محبت کرنے لگی۔ یہی عورت کی اصلی فطرت ہے

حوّا۔ (ماں کی طرح اُس پر ترس کھا کر) محبت! تم اِس کو محبت کہتے ہو! اس کو عورت کی فطرت کہتے ہو! میرے بچے اس کا نام نہ مرد ہے نہ عورت۔ نہ اس کو محبت کہتے ہیں نہ زندگی۔ تمھاری ہڈیوں میں اصلی طاقت نہیں اور نہ تمھارے جسم میں ست ہے۔

قابیل۔ ہاہا! (اپنے نیزے کو پکڑ کر پوری طاقت سے گھماتا ہے)

حوّا۔ ہاں تمکو خود اپنی طاقت کا اندازہ کرنے کے لیے چھڑی گھمانیکی ضرورت ہوتی ہے۔ تم زندگی کو بلا تلخ کیے ہوئے اور بلا کھولائے ہوئے اس کی لذت کو محسوس نہیں کر سکتے۔ تم لعا کی محبت جب تک کہ اُسکا چہرہ رنگا نہ ہو۔ تم اُس کے جسم کی گرمی نہیں محسوس کر سکتے۔ تا وقتیکہ گلہری کے سمور سے وہ ڈھکی نہو تم سوا دُکھ کے کچھ نہیں محسوس کر سکتے اور نہ سوا جھوٹ کے کسی چیز کا یقین کر سکتے۔ تم زندگی کے اُن کرشموں کو دیکھنے کے لیے سر بھی نہیں اُٹھاؤ گے جو تمھارے چاروں طرف ہے لیکن کوئی لڑائی یا موت دیکھنے کے لیے دس میل دوڑتے چلے جاؤگے

آدم۔ بس بہت کہا جا چکا۔ لڑکے کو چھوڑ دو۔

قابیل۔ لڑکا! ہاہا!

حوّا۔ آدم سے تم شاید یہ سوچ رہے کہ ممکن ہے اس کی طرز معاشرت تمھاری طرز معاشرت سے بہتر ہو۔ تم ابھی ایک آزمایش میں مبتلا ہو۔ کیا تم بھی میرے ساتھ وہ سلوک کروگے۔ جو وہ اپنی عورت کے ساتھ کرتا ہے؟

اصغر علی محمد علی تاجر عطر کے کارخانہ کو گورنمنٹ سے سند مل چکی ہے

کیا تم بھی شیر اور ریچھ کا شکار کرنا چاہتے ہو تاکہ میرے سونے کیلیے چمڑوں کی افراط ہو جائے؟ کیا میں بھی اپنا چہرہ رنگا کروں۔ اور اپنے بازؤں کو نرم و نازک بنا کر خراب کر ڈالوں؟ کیا میں بھی فاختہ بٹیر۔ اور بکری کے بچوں کا گوشت کھانے لگوں جنکا دودھ تم میرے لیے چرا کر لے آیا کروگے؟

آدم ۔ تمھارے ساتھ بسر کرنا یوں ہی ایک آزمایش ہے جیسی ہو ویسی رہو ۔ میں بھی جیسا ہوں ویسا رہوں گا ۔

قابیل ۔ تم میں سے کوئی زندگی کو نہیں جانتا۔ تم سیدھے سادے دیہاتی لوگ ہو تم اُن بیلوں ۔ گدھوں اور کتوں کے غلام اور دایہ ہو جن کو تم نے اپنی ضرورتوں کے لیے پال رکھا ہے میں تم کو اُبھار کر اس سے زیادہ بلند ہستی لاسکتا ہوں میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔ کیوں نہ ہم اپنی خدمت کے لیے مرد اور عورتوں کو پالیں۔ کیوں نہ بچپن ہی سے ان کی اس طرح پرورش کریں کہ ان کو کسی دوسری قسم کی زندگی کا علم نہ ہونے پائے۔ تاکہ وہ تسلیم کرلیں کہ ہم دیوتا ہیں اور وہ یہاں صرف اس لیے ہیں کہ ہماری زندگی کو شاندار بنائے رہیں؟ ۔

آدم ۔ (مرعوب ہو کر) یہ تو بیشک ایک زبردست خیال ہے ۔

حوّا ۔ (حقارت سے) زبردست خیال ہے!

آدم ۔ ہاں ۔ جیسا کہ سانپ کہا کرتا تھا "کیوں نہیں"؟

حوّا ۔ کیونکہ ایسے کمبختوں کو میں اپنے گھر میں نہیں رہنے دوں گی کیونکہ ایسے جانوروں سے مجھکو نفرت ہے جن کے دو سر ہوں یا جن کے اعضا سوکھے ہوں ۔ یا جو بد ہیئت ۔ ضدی اور خلاف فطرت ہوں ۔ میں نے پہلے ہی قابیل سے کہدیا کہ وہ مرد نہیں ہے اور نہ لُعا عورت ہے دونوں رُا کشش ہیں اور اب تم اُن سے بھی زیادہ خلاف فطرت راکشش پیدا کرنا چاہتے ہو۔ تاکہ تم محض سست اور بیکار ہو جاؤ اور تمھارے پالے ہوئے "انسانی جانور" محنت کو ایک جھیلنے والی بلا سمجھیں ۔ اچھا خواب ہے کیا کہنا؟ (قابیل سے) تمھارا باپ تو صرف سطحی طور پر بیوقوف ہے اور تمھاری رگ و پے میں بیوقوفی سمائی ہوئی ہے اور تمھاری بیوی تم سے بھی زیادہ بیوقوف ہے ۔

آدم ۔ میں کیوں بیوقوف ہوں؟ میں تم سے زیادہ بے وقوف کیسے ہو سکتا ہوں؟

حوّا تم نے کہا تھا کہ قتل کبھی نہیں ہوگا ۔ اس لیے کہ "آواز" ہماری اولاد کو اس سے منع کرے گی ۔ اُس نے قابیل کو کیوں نہیں منع کیا؟

قابیل ۔ اُس نے منع تو کیا تھا ۔ لیکن میں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ ایک آواز سے ڈر جاؤں "آواز" نے سمجھا تھا کہ میں بجز اپنے بھائی کا رکھوالا ہونے کے اور کچھ نہیں ہوں ۔ اُس کو معلوم ہو گیا کہ میں "میں" ہوں اور ہابیل کو بھی ہونا چاہیے اور اپنی نگرانی آپ کرنی چاہیے جس طرح کہ میں اُس کا رکھوالا تھا اُس سے زیادہ وہ میرا رکھوالا نہیں تھا ۔ پھر اُس نے تجھکو کیوں نہ مار ڈالا ۔ اگر مجھکو کوئی روکنے والا نہیں تھا ۔ تو اُس کو بھی کوئی روکنے والا نہ تھا ۔ شخصی مقابلہ تھا اور میں جیت گیا ۔ میں پہلا فاتح تھا ۔

آدم ۔ جب تم نے یہ سب سوچا تھا تو "آواز" نے تم سے کیا کہا تھا؟

قابیل ۔ کیوں؟ اُس نے مجھکو حق دیدیا اور کہا کہ میرا یہ فعل مجھپر ایک داغ ہے ۔ ایک جلا ہوا داغ ۔ تاکہ کوئی مجھکو قتل نہ کرسکے

بہترین عطر ملنے کا پتہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

جیسا کہ ہابیل اپنی بھیڑ پر لگا دیتا تھا۔ میں یہاں صحیح و سالم کھڑا ہوں اور جن بزدلوں نے کبھی قتل نہیں کیا جو اپنی بھائیوں کے رکھوالے بننے سے آسودہ ہیں وہ ذلیل سمجھکر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور خرگوشوں کی طرح مار ڈالے جاتے ہیں۔ جو قابیل کا علم بردار ہوگا وہ دُنیا پر حکومت کریگا اور وہ ہار کر گر جائیگا تو اس کا سات گنا بدلہ لیا جائیگا" آواز" نے یہ کہدیا ہے۔ لہٰذا تم کو اور دوسروں کو مجھ سے بغاوت کرتے وقت ہوشیار رہنا چاہیئے

آدم۔ لاف زنی اور گستاخی کو چھوڑو اور سچ سچ بتاؤ "کیا آواز" یہ نہیں کہتی کہ اگر کوئی دوسرا تم کو تمھارے بھائی کے قتل کے لیے مار ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تو تم خود اپنے کو مار ڈالو؟

قابیل۔ نہیں۔

آدم۔ اگر تم جھوٹ نہیں بولتے تو پھر انصاف ایزدی کوئی چیز نہیں۔

قابیل۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ انصاف ایزدی ضرور ایک چیز ہے کیونکہ "آواز" مجھسے کہتی ہے کہ میں اپنے کو ہر شخص کے سامنے پیش کروں۔ تاکہ اگر بھے مار ڈال سکے تو مار ڈالے۔ بغیر خطرہ کے میں صاحب عظمت نہیں ہو سکتا۔ ہابیل کا خونبہا میں اسی صورت میں دے رہا ہوں خطرہ اور خوف ہر ہر قدم پر میرے پیچھے ہیں۔ بغیر اس کے ہمت کے کوئی معنی نہیں ہوتے اور ہمت ہی وہ چیز ہے جو خون کو گرما کر لال اور پُر جلال بنا دیتی ہے"

آدم۔ (اپنا کلند اُٹھا کر پھر کھودنے کی تیاری کرتا ہے) اچھا اب چلے جاؤ تھاری یہ پُر جلال زندگی ایک ہزار سال تک نہیں رہیگی اور مجھکو ایک ہزار سال تک رہنا ہے تم سب اگر آپس میں یا درندوں کے ساتھ لڑنے سے اگر نہیں مروگے تو اس بلا سے مر جاؤگے جو خود تھارے اندر موجود ہے۔ تھارا جسم انسان کے جسم کی طرح نہیں بلکہ اس سماروغ کی طرح پرورش پاتا ہے جو درختوں پر اُگتا ہے۔ بجائے سانس لینے کے تم چھینکتے ہو اور کھانستے ہو اور آخر کار مرجھا کر فنا ہو جاتے ہو تھاری آنتیں گل جاتی ہیں۔ تھارے سر کے بال جھڑ جاتے ہیں۔ تھارے دانت گندے ہو جاتے ہیں اور گر جاتے ہیں۔ اور تم وقت سے پہلے مر جاتے ہو۔ اس لیے کہ تم مرنا چاہتے ہو بلکہ اس لیے کہ تم کو مرنا پڑتا ہے۔ میں کھیتی کرونگا اور زندہ رہونگا۔

قابیل۔ اور تھاری یہ ہزار برس کی زندگی تھارے کس کام کی ہے تم تو پُرانی گھاس ہو۔ سو برس تک زمین کھودتے رہنے سے کیا اب تم کچھ بہتر کھودنے لگے ہو؟ میں اتنی مدت تک نہیں جیا ہوں جتنی مدت تک کہ تم جی چکے ہو لیکن کھیتی کے فن سے متعلق جتنی باتیں ہو سکتی تھیں اُن کو میں جانتا ہوں اور اب اُس کو چھوڑ کر اُس سے بہتر فنون کے جاننے میں مشغول ہوں۔ میں لڑنا اور شکار کرنا یعنی مار ڈالنے کا فن جانتا ہوں تم کو اپنے ہزار برس کا یقین کیسے ہو سکتا ہے؟ میں ابھی تم دونوں کو مار ڈال سکتا ہوں اور تم دو بھیڑوں سے زیادہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ میں تم کو چھوڑ دیتا ہوں۔ مگر دوسرے تمکو مار ڈال سکتے ہیں۔ کیوں نہ بہادری کے ساتھ زندگی بسر کرو اور جلد مر کر دوسروں کے لیے جگہ خالی کر دو۔ میں خود جو تم دونوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ فنون جانتا ہوں اپنے سے بیزار ہو جاؤں اگر لڑنا یا شکار کھیلنا نہو۔ ایسے ہزار برس گزارنے سے پہلے ہی میں اپنے کو مار ڈالوں۔ جیسا کہ اکثر "آواز" کی طرف سے تحریک

اصغر علی محمد علی تاجر عطر بہت اچھا ہے

ہوا کرتی ہے۔

آدم۔ جھوٹے۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ "آواز" ہابیل کی جان کے بدلے میں تمھاری جان کا مطالبہ نہیں کرتی۔

قابیل۔ "آواز" مجھ سے اس طرح نہیں مخاطب ہوتی جسطرح تم سے ہوا کرتی ہے۔ میں ایک جوانمرد ہوں اور تم ایک بوڑھے بچے کوئی بچے اور جوان سے یکساں باتیں نہیں کرتا۔ اور جوان سنکر چپ چاپ کانپنے نہیں لگتا بلکہ جواب دیتا ہے اور وہ "آواز" سے اپنی تعظیم کراتا ہے اور آخر کار جو چاہتا ہے اُس سے کہلانے لگتا ہے

آدم۔ اس بُرے بول پر تمھاری زبان غارت ہو!۔

حوّا۔ اپنی زبان کو قابو میں رکھو اور میرے بچے کو کو سومت۔ للِث کی یہ غلطی تھی کہ اُس نے پیدا کرنے کی محنت کو مرد اور عورت کے درمیان غیر مساوی حصوں میں تقسیم کیا قابیل اگر ہابیل کے پیدا کرنے کی محنت تمکو برداشت کرنی پڑتی یا اُسکے مرجانے پر دوسرا آدمی پیدا کرنا پڑتا تو تم اُس کو قتل نہ کرتے۔ بلکہ اُس کی جان کو بچانے کیلیے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی بے سروپا گفتگو جس نے ابھی آدم کو بھا لیا تھا۔ جبکہ وہ اپنا کُلند پھینک کر تھوڑی دیر کیلیے تمھاری طرف متوجہ ہو گیا تھا مجھکو ایک گزرجانیوالی ہوا معلوم ہوئی جو کسی لاش پر سے بہ گئی ہو یہی وجہ ہے کہ پیدا کرنیوالی عورت اور فنا کرنیوالے مرد کے درمیان دشمنی ہے میں تمکو جانتی ہوں تم آرام طلب اور نفس پرست ہو۔ زندگی کو پیدا کرنا محنت اور دشواری کا کام ہے جس کے لیے ایک مدت کی ضرورت ہے۔ دوسروں کی پیدا کی ہوئی زندگی کو جُرا لیجانا آسان ہے اور تھوڑی دیر کا کام ہے۔ جب تک تم کھیتی کرتے رہے تم دنیا کو زندہ اور پیدا کرنیکے قابل بنائے ہوئے تھے جس طرح کہ میں زندہ ہوں اور پیدا کرتی ہوں۔ للِث نے تم کو اسی لیے عورتوں کی محنت سے آزاد رکھا تھا چوری اور قتل کے لیے نہیں۔

قابیل۔ شیطان اس کا شکرگزار ہو! میں اپنے پاؤں تلے کی مٹی کے ساتھ شوہر کا کھیل کھیلنے سے بہتر اپنے وقت کا مصرف نکال سکتا ہوں۔

آدم۔ شیطان؟ یہ کون سا نیا لفظ ہے؟

قابیل۔ سنو جب کبھی تم نے "آواز" کا ذکر کیا جو تم کو باتیں بتایا کرتی ہے تو میں نے کبھی دل لگا کر تمھاری بات نہیں سُنی ہے۔ دو آوازیں ہونگی ایک تو وہ جو تم کو ملامت کرتی ہے اور ناچیز سمجھتی ہے۔ دوسری وہ جو میری تعظیم کرتی ہے اور مجھپر اعتماد رکھتی ہے۔ میں تمھاری آواز کو "شیطان کی آواز" کہتا ہوں اور اپنی آواز کو "خدا کی آواز"

آدم۔ میری آواز زندگی کی آواز ہے اور تمھاری آواز موت کی۔

قابیل۔ اچھا یونہی سہی۔ کیونکہ وہ مجھ سے کہتی ہے کہ موت درحقیقت موت نہیں ہے۔ بلکہ ایک دروازہ ہے دوسری زندگی کا یعنی زندگی جو زیادہ پُرزور اور شاندار ہے۔ جو صرف روح کی زندگی ہے جس میں مٹی کے ڈھیلے اور تیشے یا بھوک اور تکان نہیں۔

حوّا۔ نفس پرستی اور کاہلی کی زندگی قابیل میں خوب جانتی ہوں۔

قابیل نفس پرستی کی زندگی۔ ہاں کیوں نہیں۔ ایسی زندگی جس میں کوئی اپنے بھائی کی محافظت نہیں کرتا اس لیے کہ اُس کا بھائی اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے۔ لیکن کیا میں کاہل ہوں؟ تمھاری محنت کی زندگی کو چھوڑ کر کیا مجھے اُن آفتوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کرنا نہیں پڑا ہے جن کا تم کو کوئی تجربہ نہیں۔ تیر ہاتھ میں تیشے سے ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو طاقت تیر کو اڑنے والے کے سینہ میں

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر حنا بہت مشہور ہے

اُتار دیتی ہے - اور جو طاقت تیشے کو بے ضرر اور کثیف مٹی کے اندر پیوست کر دیتی ہے ان دونوں میں آگ و ر پانی کی نسبت ہے میری طاقت دس کی طاقت کے برابر ہے - اس لیے کہ میرا دل پاک ہے -

آدم - یہ کیا لفظ ہے ؟ پاک کے کیا معنی ؟

قابیل - جو مٹی سے منحرف ہو کر اوپر سورج اور صاف و شفاف آسمان کیطرف مائل ہو -

آدم - بچے آسمان تو خلا ہے لیکن زمین پھلوں سے معمور ہے - زمین ہمکو غذا دیتی ہے - اور ہم کو وہ قوت بخشتی ہے جس سے ہم نے تمکو اور تمام نوع انسان کو پیدا کیا - آج اُس مٹی سے بے تعلق ہو جاؤ جس کو تم حقیر سمجھتے ہو تو بری طرح برباد ہو جاؤ گے -

قابیل - مجھکو مٹی سے نفرت ہے مجھکو غذا سے نفرت ہے - تم کہتے ہو کہ زمین ہم کو طاقت بخشتی ہے لیکن کیا یہی زمین غلیظ ہو کر ہمکو بیماریوں کا شکار نہیں بناتی ؟ مجھکو اُس پیدا کرنے سے نفرت ہے جسپر تمکو اور ماں کو ناز ہے اور جو ہم کو پست کر کے جانوروں سے ہم سطح کر دیتا ہے اگر انجام بھی یہی ہونا ہے جیسا کہ آغاز رہا ہے تو نوع انسان کا مٹ جانا اچھا - اگر مجھکو ریچھ کی طرح پیٹ بھرنا ہے اگر لعا کو ریچھ کی طرح بچے جننا ہے تو میں بجائے انسان کے ریچھ ہی ہونا پسند کروں گا کیونکہ ریچھ اپنے سے شرماتا نہیں اُسکو اپنے سے بہتر چیز کا علم نہیں ہوتا اگر تم ریچھ کی طرح آسودہ ہو تو میں نہیں ہوں - تم اُس عورت کے ساتھ رہو جو تمکو بچے دے - میں اُس عورت کے پاس جاؤنگا جو مجھے "خواب" دے تم اپنی غذا کے لیے زمین ٹٹولتے رہو میں اپنی غذا اپنے تیر کے ذریعے یا تو آسمان سے لاؤنگا یا اُسوقت اُسکو گرا دونگا جبکہ وہ اپنی زندگی کے زعم میں زمین پر چلتی پھرتی ہوگی - اگر میرے لیے بس یہی دو صورتیں ہیں کہ غذا حاصل کروں یا مر جاؤں تو اپنی غذا کو زمین سے جہاں تک ممکن ہو گا فاصلہ پر سے حاصل کرونگا - بیل قبل اس کے کہ وہ مجھے ملے گھاس سے بہتر غذا فراہم کریگا اور چونکہ انسان بیل سے زیادہ برگزیدہ ہے اس لیے کسی دن میں اپنے دشمن کو بیل کھانے کے لیے دونگا اور پھر اُسکو مار کر خود کھا جاؤں گا -

آدم - راکشش ! سنتی ہو حوا ؟ -

حوا - تو اپنے منھ کو صاف اور شفاف آسمان کیطرف مائل کرنے سے یہی مراد ہے !

آدم غوری ! بچوں کو کھا جانا اس کا تو بالکل وہی انجام ہوگا جو بھیڑوں اور بکری کے بچوں کا ہوا تھا جبکہ ہابیل نے بھیڑ اور بکری سے شروع کیا تھا آخر تم بیچارے احمق ہی رہے کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے ان باتوں پر غور نہیں کیا ہے ؟ میں جس کو بچہ جننے کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے اور جسکو کھانا تیار کرنے کی محنت گوارا کرنی ہوتی ہے - مجھے بھی اپنے بچے کے متعلق یہ خیال تھا کہ شاید میرا قوی ہیکل اور بہادر لڑکا کسی بہتر چیز کا تصور کرے اور اُس کی خواہش کرے اور ممکن ہے اُسکا ارادہ بھی کرے یہاں تک کہ اُسکو پیدا کرے اور نتیجہ یہ ہو کہ وہ ریچھ ہونا اور بچوں کو کھا جانا چاہتا ہے - ریچھ بھی آدمی کو نہ کھائے اگر اُس کو شہد ملتا رہے -

قابیل - میں نہ ریچھ ہونا نہیں چاہتا اور نہ بچوں کا کھانا چاہتا ہوں میں خود نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں بجز اس کے کہ اس احمق بڈھے کسان سے کچھ بہتر ہونا چاہتا ہو ... رہتے ہیں ... نے اس لیے بنایا تھا کہ مجھکو پیدا کرنے میں تمھاری مدد کیا ہے ؟ ... اب حقیر سمجھتی ہو اس لیے کہ وہ تمھاری غرض یہ ہے خوفناک سوال

آدم (غصہ سے بھر گیا - بس اتنا کہدینا کافی ابھی دکھا دوں کہ میرا کلند

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

تمہارے نیزے کے ہوتے ہوئے تمہارے نافرمان سر کو دو ٹکڑے کر سکتا ہے

قابیل۔ نافرمان! ہا ہا! (اپنے نیزے کو گھما کر) آؤ اب کے بڈھے باپ آزمالو! لڑائی کا ذرا مزہ چکھ لو۔

حوّا۔ بس بس احمقو بیٹھ جاؤ اور خاموش ہو کر میری بات سنو (آدم بیدلی سے اپنے شانوں کو حرکت دیکر تیشہ پھینک دیتا ہے قابیل بھی ہنستا ہوا نیزہ اور ڈھال کو زمین پر ڈالدیتا ہے دونوں بیٹھ جاتے ہیں) میں نہیں کہہ سکتی کہ تم میں سے کون زیادہ مجھکو آسودہ کر رہا ہے۔ تم اپنی کھیتی سے زیادہ اپنے گندے قتل سے میں سمجھتی ہوں کہ اللہ نے تمکو زندگی کے ان آسان طریقوں میں سے کسی کے لیے بھی آزاد نہیں کیا تھا (آدم سے) تم درختوں کی جڑ کھودتے ہو اور زمین کے اندر سے غلہ نکالتے ہو آسمان سے کوئی خداداد غذا کیوں نہیں اُتارتے۔ وہ اپنی غذا کے لیے چوری اور قتل کرتا ہے حیات بعد ممات پر بیکار شاعری کرتا ہے اور اپنی ہیبت ناک زندگی کو خوشنما الفاظ میں اور اپنے مریض جسم کو اچھے کپڑوں میں تاکہ لوگ بجائے چور اور قاتل سمجھکر کوسنے کے اُس کی عزت اور تعظیم کریں آدم کے سوا تم سب انسان میری اولاد اور میری اولاد کی اولاد ہو۔ تم لوگ میرے پاس آتے ہو اور اپنی نمایش کرنا چاہتے ہو مگر تمہاری ساری عقل اور قابلیت تمہاری ماں حوّا کے سامنے غائب ہو جاتی ہے۔ کسان آتے ہیں لڑنے مرنے والے آتے ہیں مگر دونوں سے یکسر اکتا جاتی ہوں کیونکہ وہ یا تو پچھلی فصل کی شکایت کرتے ہیں یا اپنے آرام طلب اور فخر کرتے ہیں حالانکہ پچھلی فصل بالکل پہلی فصل کی سی ادنیٰ کا کام ہے لڑائی محض پہلی لڑائی کا اعادہ ہوتی ہے میں ان کی پیدا کی ہوئی تھکی ہوں بعض اوقات اپنے سب سے چھوٹے بچے کا ذم ہے جب تک تم کھیتی پر پیارے بچے نے دو کل کہا ہے یا یہ کوہ اور بچوں سے زیادہ انوکھا اور مسخرہ ہے۔ اور مجھکو دلچسپی اور حیرت اور مسرت کا اظہار کرنا پڑتا ہے حالانکہ پچھلا لڑکا بالکل پہلے لڑکے کی طرح ہوتا ہے ورنہ وہ کوئی ایسی نئی بات نہیں کہتا جس کو تمہارے اور ہابیل کے منھ سے سنکر میں نے اور آدم نے لطف نہ اٹھایا ہو۔ جس سے کہ تم دونوں دنیا میں سب سے پہلے بچے تھے اور ہم کو اُس حیرت و مسرت سے معمور کرتے تھے جسکو جب تک یہ دنیا قائم رہے گی پھر کوئی دو شخص نہیں محسوس کر سکتے جب میں پیدا کرنے کے قابل نہیں ہونگی تو اپنے پرانے باغ میں جو خار و خس کا ایک انبار ہو رہا ہے چلی جاؤنگی اس خیال سے کہ شاید بات کرنے کیلیے پھر سانپ مل جائے۔ لیکن سانپ کو تم نے ہمارا دشمن بنا دیا ہے اُس نے باغ چھوڑ دیا ہے یا مر گیا ہے میں اب اُسکو کبھی نہیں دیکھتی اس لیے مجھکو واپس آنا پڑتا ہے اور آدم کی اُلجھی باتوں کو سننا پڑتا ہے جن کو دس ہزار بار سن چکی ہیں یا پر پوتے کی میزبانی کرنی پڑتی ہے جو ابھی جوان ہو چکا ہے اور اپنی عظمت سے مجھکو مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ اُف! کیسی تھکا دینے والی زندگی ہے اور ابھی اسیطرح تقریبًا سات سو برس کاٹنے ہوں گے

قابیل۔ غریب ماں! دیکھتی ہو زندگی کتنی طویل ہے۔ انسان ہر چیز سے تھک جاتا ہے۔ آسمان کے نیچے کوئی چیز نئی نہیں۔

آدم۔ (حوا سے حقارت کے لہجہ میں) اگر تم کو شکایت کرنے کے سوا کوئی کام نہیں ہے تو تم کیوں جی رہی ہو؟

حوّا۔ اس لیے کہ ابھی امید باقی ہے۔

قابیل۔ کس بات کی؟

حوا۔ تمہارے اور میرے خواب کے سچ ثابت ہونے کی نئی اور بہتر چیزوں کے پیدا ہونے کی میری اولاد اور میری اولاد کی اولاد کسان ہیں اور نہ جنگجو

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر بہت اچھا ہے

ان میں سے بعض لوگ کھیتی کریں گے۔ نہ لڑائی۔ وہ تم دونوں سے زیادہ کارآمد ہیں۔ وہ کمزور ہیں۔ بزدل ہیں اور نمایش کے دلدادہ ہیں۔ تاہم وہ کثیف رہتے ہیں اور بال کٹانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ وہ قرض لیتے ہیں اور کبھی ادا نہیں کرتے۔ اسپر بھی انکو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے لوگ اُن کو دیدیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ خوبصورت الفاظ میں۔ خوبصورت جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ اپنے خواب کو یاد رکھ سکتے ہیں وہ بلا سوئے ہوئے خواب دیکھ سکتے ہیں۔ اُن کی قوت ارادی ایسی نہیں کہ وہ بجائے خواب دیکھنے کے پیدا کرسکیں۔ لیکن سانپ نے کہا تھا کہ وہ لوگ جو زبردست عقائد رکھتے ہیں۔ ہر خواب کو اپنے ارادہ سے پیدا کرسکتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو نے کے چند ٹکڑے کاٹ کر اُن کو پھونکتے ہیں جن سے ہوا میں آواز کے دلفریب نغمے پیدا ہوتے ہیں اور بعض تو ان مختلف نمونوں کو باہم ملا دیتے ہیں اور تین تین ٹکڑوں سے ایک ہی وقت آواز نکالتے ہیں اور میری روح کو اُبھار کر ان چیزوں تک پہونچا دیتے ہیں جن کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اور بعض مٹی کے جانور بناتے ہیں اور پتھر پر صورتیں کندہ کرتے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ ان صورتوں کی عورتیں پیدا کرو۔ میں نے ان صورتوں پر غور کیا ہے اور پھر ارادہ کیا ہے اور ایک لڑکی پیدا بھی کی ہے جو اب بڑھکر اُن صورتوں سے مل گئی ہے۔ اور کچھ لوگ ہیں جو بغیر انگلیوں پر گنے ہوئے تعداد کو سوچ لیتے ہیں اور رات کے وقت آسمان کیطرف دیکھا کرتے ہیں۔ یہ لوگ ستاروں کے نام رکھتے ہیں اور پہلے سے یہ بتا سکتے ہیں کہ سورج کب سیاہ توے سے ڈھک جائیگا۔ طوبال کو دیکھو جس نے اس چرخہ کو بنا کر ہری محنتوں کو بہت کچھ گھٹا دیا ہے۔ پھر جنوک کو دیکھو جو پہاڑوں پر پھرا کرتا ہے اور برابر "آواز" کی باتیں سنا کرتا ہے اس نے اپنی مرضی کو اس "آواز" کی مرضی پوری کرنیکے لیے چھوڑ دیا ہے۔ خود اُس میں بہت کچھ "آواز" کی بزرگی آگئی ہے جب یہ لوگ آتے ہیں تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی بات یا نئی اُمید ضرور ہوتی ہے اور زندہ رہنے کیلیے بہانہ ملجاتا ہے وہ کبھی مرنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ ہمیشہ سیکھتے رہتے ہیں اور کوئی نہ کوئی اور چیز یا علم پیدا کرتے رہتے ہیں اور اگر پیدا نہیں کرتے تو کم از کم اُن کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور اس کے بعد بھی قابیل تم اپنی لڑائی اور غارتگری پر احمقوں کیطرح اتراتے ہوئے آتے ہو اور مجھ سے کہتے ہو کہ "یہ سب نہایت شاندار ہے میں شجاع ہوں اور موت یا موت کے خوف کے سوا کوئی دوسری چیز زندگی کو خوشگوار نہیں بنا سکتی" بس شریر لڑکے یہاں سے چلے جاؤ اور تم آدم اپنا کام دیکھو اور اس کی باتیں سننے میں اپنا وقت نہ ضائع کرو۔

قابیل۔ میں شاید بہت عقلمند تو نہیں ہوں۔ لیکن ——

حوا۔ (بات کاٹ کر) ہاں شاید نہیں ہو مگر اسپر ناز نہ کرو یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے۔

قابیل۔ تاہم ہاں میرے اندر ایک ایسی قوت ہے جو مجھکو بتاتی ہے کہ موت زندگی میں اپنا حصہ ضرور لیتی ہے اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ موت کو ایجاد کس نے کیا؟

آدم چونک پڑتا ہے۔ حوا اپنا چرخہ چھوڑ دیتی ہے۔ دونوں انتہائی گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہیں۔

قابیل۔ تم دونوں کو کیا ہوگیا ہے؟

آدم۔ لڑکے تم نے ہم سے ایک خوفناک سوال کیا ہے۔

حوا۔ تم نے قتل ایجاد کیا۔ بس اتنا کہدینا کافی سمجھو۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے مشکی زردہ منگائیے

قابیل۔ قتل موت نہیں ہے۔ تم میرا مطلب سمجھے ہو۔ جنکو میں قتل کرتا ہوں اگر انکو چھوڑ دوں تو بھی وہ مر جائینگے۔ اگر میں قتل نہ کیا جاؤں تو بھی مر جاؤنگا۔ مجھکو اسمیں کس نے مبتلا کیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ موت کو کس نے ایجاد کیا؟

آدم۔ ارے عقل کی بات کرو۔ کیا تم ہمیشہ کی زندگی برداشت کر سکتے تھے؟ تمھارا خیال ہے کہ برداشت کر سکتے تھے چونکہ جانتے ہو کہ اپنے خیال کو آزما نہیں سکتے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ دوام و بقا کے خوف میں تجھکر اپنی قسمت کو جھینکنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ذرا غور تو کرو۔ کبھی چھٹکارا نہ ہوتا! اور دریا کے کنارے ریت کے جتنے ذرے ہیں اُن سے بھی زیادہ دنوں تک آدم ہی آدم رہنا اور پھر بھی انجام سے اسیقدر دور رہنا جسقدر کہ پہلے تھے! میرے نزدیک کچھ بھی نہیں ہے جس سے مجھکو نفرت ہے اور جسکو میں نکال کر پھینک دینا چاہتا ہوں۔ اپنے الدین کے شکر گزار ہو جنھوں نے تمکو اس قابل بنایا کہ اپنا بوجھ نسلوں اور بہتر آدمیوں کے حوالہ کر دو اور اسطرح تمھارے لیے ہر ایک دائمی سکون مہیا کیا۔ کیونکہ ہمیں نے موت کو ایجاد کیا تھا۔

قابیل۔ (اٹھکر) تم نے اچھا کیا۔ میں بھی ہمیشہ زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر موت کو تمنے ایجاد کیا تو مجھکو الزام نہ دو۔ کیونکہ میں موت کا ناظم ہوں۔

آدم۔ میں تمکو الزام نہیں دیتا۔ اطمینان سے چلے جاؤ۔ مجھے کھیتی کیلئے اور اپنی ماں کو چرخہ کاتنے کے لیے چھوڑ دو۔

قابیل۔ تمکو اسکے لیے چھوڑ دیتا ہوں لیکن میں نے تم لوگوں کو ایک بہتر راستہ دکھا دیا ہے (ڈھال اور نیزہ اٹھا لیتا ہے) میں اپنے بہادر سورما دوستوں اور انکی حسین عورتوں کے پاس چلا جاؤنگا (کانٹوں کی باڑ کی طرف چلا جاتا ہے) جب آدم زمین کھودا کرتا تھا اور حوا چرخہ چلایا کرتی تھی تب مہذب انسان کہاں تھے؟ (ٹھٹھکتا ہوا جاتا ہے اور پھر جب ہو کر دور سے پکارتا ہے) ماں۔ رخصت۔

آدم۔ (بڑبڑاتے ہوئے) ناکارہ کُتّا! ٹٹی کو پھر بند کر سکتا تھا (وہ خود ٹٹی کو راستہ میں کھڑی کر دیتا ہے) اُسکی اور اُسی قسم کے لوگوں کی بدولت موت زندگی پر غالب ہوتی جاتی ہے۔ اسیقدر دیکھو کہ میرے اکثر پوتے اور نواسے زندگی کو پوری طرح جاننے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں

آدم۔ کچھ پرواہ نہیں (اپنے ہاتھ پر تھوکتا ہے اور اپنا کُلند اٹھا لیتا ہے) زراعت سیکھنے کیلیے زندگی ابھی کافی طویل ہے اگرچہ یہ لوگ مختصر بنا رہے ہیں۔

حوّا۔ (سوچتے ہوئے) ہاں زراعت کے لیے اور لڑنے کیلیے۔ لیکن کیا دوسرے اہم کاموں کیلیے بھی زندگی کافی طویل ہے؟ کیا یہ لوگ اتنی مدت تک زندہ رہینگے کہ "من" کھا سکیں؟

آدم۔ من کیا ہے؟

حوا۔ وہ غذا جو آسمان سے لائی جائے۔ جو ہوا سے بنی اور گندے طریقے سے زمین میں کھود کر نکالی گئی ہو کیا لوگ اپنی مختصر عمر میں تمام ستاروں کی رفتار جان لینگے؟ جو خدا کے تو وہ آواز کی کہانی سیکھنے میں دو سو برس لگ گئے جب وہ محض ایک سو برس کا ایک بچہ تھا تو اسکی آواز کو سمجھنے کی طفلانہ کوششیں قابیل کے غیظ و غضب سے زیادہ خطرناک تھیں جب انکی عمریں مختصر ہو جائینگی تو لوگ کھیتی کرینگے لڑینگے مارینگے اور مرینگے اور انکے بچے جو لوگ انسے کہیں گے کہ "آواز" کی مرضی یہی ہے کہ وہ ہمیشہ یا تو کھیتی کرتے رہیں یا لڑتے رہیں اور مارتے مرتے رہیں۔

آدم۔ اگر وہ خود کاہل ہیں اور مرنا انکا ارادہ ہی ہے کہ مر جائیں تو میں انکو روک نہیں سکتا۔ میں ایک ہزار برس تک جیتا رہونگا اگر انکو یہ منظور نہیں تو وہ مر جائیں اور لعنت میں مبتلا رہیں۔

حوّا۔ لعنت؟ یہ کیا ہے؟

آدم۔ یہ اُن لوگوں کی حالت ہے جو موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ تم چرخہ چلائے جاؤ۔ بیکار نہ بیٹھی رہو جبکہ میں تمھارے لیے رگ و پے کی قوت صرف کر رہا ہوں۔

حوا۔ (آہستہ سے چرخہ گھماتے ہوئے) اگر تم قوت نہ ہوتے تو ہم دونوں کھیتی کیلیے اور چرخہ سے بہتر زندگی کا کوئی ذریعہ نکال لیتے

آدم۔ اپنا کام کرو ورنہ بلا روٹی کے رہنا پڑے گا

حوا۔ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہیگا اور بھی کوئی چیز ہے ہم ابھی نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے لیکن کسی روز ہم کو معلوم ہو جائیگا اور تب ہم تنہا اسی زندگی بسر کرینگے اور پھر کبھی ہیجانی چرخہ نہ چلاؤنگی نہ مارنا۔ وہ مجبور ہو کر چرخہ چلاتی ہے۔ آدم بے صبری کے ساتھ زمین کھودتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ چاندنی چوک دہلی میں ہے

شمالی ہند اور دکن

(مسلسل)

پھر اکبر نے اپنے دستور کے مطابق شہزادہ دانیال کے لئے ابراہیم عادل شاہ کی بیٹی بیگم سلطانہ کی خواستگاری کی، ابراہیم عادل شاہ نے بخوشی اس کو منظور کرلیا دونوں طرف تیاریاں شروع ہوگئیں۔ پانچ سال کا عرصہ بات ہی بات میں گذر گیا، آخرکار یہ قرار پایا کہ شاہزادہ دانیال برہان پور سے احمد نگر آکر عقد کرلے چلا جائے، اور اسی غرض سے دلہن کو سنہ ۱۰۰۸ھ میں احمد نگر روانہ کردیا حسب قرارداد شہزادہ دانیال احمد نگر آیا لیکن بزم شادی پٹن میں قرار دی۔ وہاں بڑا جشن کرکے برہان پور روانہ ہوا، لیکن زیادہ عرصہ نہ گذرا ہوگا کہ شہزادہ نے کثرت شراب خواری سے انتقال کیا۔[۵۱]

اکبر رسید گڑھ کے محاصرہ میں مشغول تھا کہ اس کو شہزادہ سلیم کی بغاوت کی خبر ملی، اپنے تمام منصوبے بغیر پورے کئے آگرہ کی طرف روانہ ہوا، اس نے شاہزادہ دانیال کی صوبہ داری میں دکن کے تین صوبہ احمد نگر، برار، اور خاندیس دمالوہ و گجرات کے دیدیے؛ اور خانخاناں کو اس کا وزیر مقرر کیا۔ ایسی حالت میں جب کہ بہادر نظام شاہ قید کرلیا گیا تھا، احمد نگر کی سلطنت مفتوح اور سلطنت مغلیہ میں داخل ہوگئی تھی؛ اگر اکبر کو سلیم کی بغاوت کی وجہ سے جانا نہ پڑتا تو وہ مکمل طور پر دکن کا انتظام کردیتا لیکن اکبر کے جاتے ہی بدامنی پھیلی اور نظام شاہی امرا کو اپنی قوت بڑھانیکا موقع ملا۔ اسی دوران میں دکن میں ایک ایسی جلیل القدر شخصیت نمودار ہوئی، جس نے شاہان مغلیہ کو تادم مرگ پریشان کیا، اور بالاخر ایک ایسی قوم کو تربیت دیکر شاہراہ ترقی پر چھوڑ گیا جس نے آخرکار مغلیہ سلطنت کی بیخکنی کی، یہ قوم جو رفتہ رفتہ ترقی کرکے دکن کے بڑے حصے کی حکمراں ہوگئی مرہٹہ قوم تھی، ملک عنبر یہ وہ شخص تھا جس نے احمد نگر کی برباد شدہ سلطنت کو باد مخالف کے تھپیڑوں سے بچالیا اور اپنے مرنے تک اس کو استحکام پہنچانے کی کوشش کرتا رہا، اور مغلوں کو چین لینے نہ دیا، ابتدا میں ملک عنبر اور راجو میاں دکھنی نے بقول ماثرالامرا علم بغاوت بلند کیا اور احمد نگر کا بڑا حصہ فتح کرلیا بعدازاں ان دونوں کے درمیان پھوٹ پڑگئی اور خانخاناں نے ملک عنبر کو اطاعت پر مجبور کیا، خانخاناں کی اعانت پر عنبر نے راجو کا مقابلہ کیا۔ اور اس کو شکست دیکر کھڑکی کو پایہ تخت قرار دیکر مرتضیٰ نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا،[۵۲] اور راجو کو گرفتار کرکے قلمرو نظام شاہی میں مرتضیٰ نظام شاہ کا سکہ چلایا اور افواج مغلیہ سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کردیں، جہانگیر کی بغاوت اور اس کے بعد خسرو کی بغاوت اور جہانگیر کی مشغولیت سے فائدہ اٹھاکر محلات شاہی پر قبضہ کرلیا، ملک عنبر نے جب سنا کہ سنہ ۱۰۱۴ھ میں اکبر کا انتقال ہوگیا ہے اور جہانگیر تخت نشین ہوکر خسرو وغیرہ کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف ہے اور خانخاناں بھی دکن میں نہیں ہے تو اس نے قوت بڑھانے کی فکر کی، ملک کا اچھی طرح انتظام کیا۔ شاہان دکن سے دوستانہ مراسم پیدا کئے امیر برید ثانی کو اپنے موافق بنالیا، اور سلطان ابراہیم عادل شاہ کو بیحد خوشامدانہ خط لکھا، جس میں مغلوں کے مقابلہ کے لئے نظام شاہی حکومت کی حمایت کی درخواست کی اور لکھا کہ چونکہ دشمن کے مقابلہ میں یہ دونوں سلطنتیں ایک ہی حکم میں ہیں لہذا دونوں کو متحد ہوکر مدافعت کرنا چاہیئے سلطان ابراہیم نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔[۵۳] جب جہانگیر کو شمال میں استقلال حاصل ہوا تو خانخاناں کی درخواست پر کہ وہ دو سال میں احمد نگر کو پاک صاف کردیگا خانخاناں کو سنہ ۱۰۱۷ھ میں دکن کی طرف روانہ کیا، بعدہ سنہ ۱۰۱۸ھ میں جہانگیر نے خیال کیا کہ بہتر ہوگا کہ "بجہت نظام سلطنت و سرانجام مہمات صوبہ دکن ضرور است کہ یکے از شاہزادہ روانہ سازد"

[۵۱] بساتین السلاطین ۲۵۰ [۵۲] بساتین السلاطین ۲۶۱ [۵۳] اقبال نامہ جہانگیری ۳۴ [۵۴] تزک جہانگیری ۴۷

بنا بریں شہزادہ پرویز کو صوبہ دار بنا کر روانہ کیا اور آصف خاں کو اس کا اتالیق مقرر کیا، اور امیر الامراء دیگر امرا کو اس کی مدد کے لئے متعین کیا۔[۵۱] وہی رفتار بے ڈھنگی جاری رہی، امرا کے درمیان اتفاق مفقود تھا، جس کی بنا پر مغلیہ فوج کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، ابھی شہزادہ پرویز برہان پور نہ پہنچا تھا کہ خانخاناں اور امرا کی عرضداشت پہنچی کہ دکھنی پر آمادۂ فساد ہیں، اس خبر کو سن کر جہانگیر نے بذات خود دکن جانیکا ارادہ کیا، مگر پھر یہ ارادہ فسخ کیا اور خانجہان کو دکن روانہ کیا۔[۵۲]

عادل شاہی اور نظام شاہی فوج نے شاہی لشکر کو شکست دی اور ایسا پریشان کیا کہ بہت برے شرائط صلح پر خانخاناں نے دستخط کر دیئے، جس کے متعلق تزک جہانگیری میں لکھا ہے:-

"بنا بر مصلحت وقت صلح گونہ با مخالفان نمودہ سلطان پرویز لشکر بہ برہان پور باز گردانید"[۵۳]

اور دکھنیوں نے "اختلاف رای و نفاق امرا" سے فائدہ اٹھا کر قلعۂ احمد نگر کا محاصرہ کر لیا، چونکہ غلہ کی کمی تھی اور برہان پور سے رسد نہ پہنچی اس لئے خواجہ بیگ صفوی نے قلعہ حوالہ کر دیا سنہ ۱۰۱۹ھ میں دس برس کے بعد نظام شاہی دار السلطنت پر دکھنیوں کا پھر قبضہ ہوگیا۔[۵۴]

اس شکست اور صلح کے بعد خانجہاں کی عرضداشت پہنچی کہ "ایں خلل و پریشانی تمام از نفاق خانخاناں دست دادہ"[۵۵] اور اس امر کی درخواست کی کہ خانخاناں کو مستقل طور پر اس خدمت پر مامور کر دیا جائے یا واپس بلا لیا جائے اور یہ وعدہ کیا کہ اگر اس کو اس خدمت پر مقرر کیا جائے تو وہ دو سال کے اندر تمام فساد کو فرو کر کے بیجاپور کو بھی قلمرو مغلیہ میں شامل کر دیگا۔ علاوہ ازیں خانخاناں نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تھا اس لئے سپہ سالاری خانجہاں کی تفویض کی گئی اور خانخاناں واپس بلا لیا گیا۔[۵۶] اور خانجہاں کی امداد کے لئے خان اعظم راجہ مان سنگھ اور آصف خاں جیسے بہادر سردار روانہ کئے گئے لیکن باوجود اس کے کامیابی حاصل نہیں ہوئی، تمام سردار ناکامی کا الزام ایک دوسرے پر دھرتے تھے حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ مغلیہ سردار دوبدو کے میدانی لڑائی کے مرد تھے، وہ اس طریق لڑائی کو جس کا بانی ملک عنبر تھا نہ سمجھ سکے جس کی وجہ سے وہ برابر مغلیہ فوج کو پریشان کرتا رہا، اور یہی وجہ تھی جس کے باعث مغلیہ سپہ سالار اس طرز کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے آخر کار سنہ ۱۰۲۰ھ میں احمد نگر کے خلاف ایک عظیم الشان مہم کی تیاری کی گئی:

عبد اللہ خاں کو گجرات کا صوبہ دار کر کے جہانگیر نے یہ حکم دیا کہ وہ ناسک اور ترنبک کی سمت سے خانجہاں کی امداد کے لئے حملہ کرے، جو برار اور احمد نگر کی طرف سے حملہ کرنے والا تھا اور یہ تاکید کی کہ جس دن خانجہاں عنبر کے مقابلہ پر پہنچے وہ مع اپنی فوج کے خانجہاں کی امداد کرے، مگر افسوس ہے کہ مغلیہ سردار کے درمیان اتفاق عنقا تھا جہانگیر کی اس معقول تدبیر پر عمل نہ کیا گیا، عبد اللہ خاں نے اس خیال سے کہ دکن کی فتح اپنے ہی نام پر ہو،

---

۵۱ اقبال نامہ جہانگیری ۴۷

۵۲ تزک جہانگیری ۷۷

۵۳ تزک جہانگیری ۷۶ اور اقبال نامہ جہانگیری ۴۵

۵۴ بساتین السلاطین ۲۷۰

۵۵ تزک جہانگیری ۸۶

۵۶ اقبال نامہ جہانگیری ۴۵

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

بنیر خانجہان سے اتحاد قایم رکھے، اور بلا اپنے حملہ کی اطلاع دئیے اور اس کی فوج کا انتظار کئے بالاگھاٹ کے پار گذر کر دشمنوں کے ملک میں داخل ہوا[51] ملک عنبر نے میدانی لڑائی کی بہ نسبت قزاقانہ جنگ کو پسند کیا اور عبد اللہ خاں کی فوج کو تنگ کرنا شروع کیا۔ رسد، سامانِ جنگ، اور باربرداری کے اونٹوں کو لوٹ لیتا اور موقع پاکر سپاہیوں کو قتل کر دیتا۔ جس کی وجہ سے عبد اللہ خاں کی فوج میں اضطراب پھیل گیا، اسی حالت میں وہ دولت آباد پہنچ گیا لیکن دشمنوں نے حملہ ہائے پیاپے اور جنگ فراری سے ایک آفت مچادی، پریشان ہوکر اُس نے مراجعت کا ارادہ کیا، واپسی کے دوران میں بجد نقصان اٹھایا۔ دکھنی فوج عقب اور پہلو پر برابر حملہ کرتی رہی، اور اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ وہ بگلانہ کی سرحد سے پار نہ گذر گیا، اس شکست کو تزک جہانگیری میں نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے کہ:۔

"شکست عبد اللہ خاں مارہٹہ از ممر غرور و تیز جلو یہائے وسخن نشنویہائے او و بارہ بسبب نفاق و بے اتفاقی امرا واقع شدہ بود"[52]

اس شکست کی خبر سنکر جہانگیر کو بہت غصہ آیا، اس کی اس عظیم الشان اسکیم کے یوں ضایع جانیکا بہت رنج ہوا، حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے خود جانیکا ارادہ[53] لیکن اس کو فسخ کیا۔ "چونکہ امرا و دولت خواہان بدین معنی اصلا راضی نشدند"[54] ایک مجلس جو اس معاملہ پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی اس میں خواجہ ابو الحسن کی تحریک پر "رایہائے ہمہ بایں قرار یافت کہ خانخانان را باید فرستاد"[55] خانخانان دوبارہ فتح دکن کے لئے روانہ کیا گیا، اس وقت حالات موافق ہوگئے تھے، آصف خاں اور جعفر بیگ برہان پور میں پیوند زمین ہو چکے تھے، امیر الامرا شریف خاں کا انتقال ہو چکا تھا، خان اعظم سنہ ۱۶۱۳ء میں مالوہ کی صوبہ داری پر بھیجدیا گیا تھا، سنہ ۱۶۱۵ء میں مان سنگہ بھی مرگیا، اور اس طرح سے خانخان کے لئے میدان خالی ہوگیا تھا۔ اور دکھنیوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی، خانخان نے اُن کی مخالفت کی آگ کو اور تیز کیا، بعض سردار اس سے آملے، گو عنبر نے گولکنڈہ اور بیجاپور سے اتحاد قایم کر لیا تھا۔ تاہم اسمیں کمزوری پیدا ہو چلی تھی، خانخان کے مزاج میں تساہل تھا، اس نے دکن میں آکر آہستہ آہستہ کارروائی شروع کی بالآخر اُس کے بیٹے شاہنواز خاں نے دکھنیوں کو شکست دیکر کھڑکی کو تباہ و برباد کیا اور اس خوف سے کہ دکھنی مجتمع ہوکر فساد مچائیں گے وہ اپنے مقام سکونت کو واپس ہوگیا[56]

بظاہر حالت کچھ سدھر چلی تھی، تاہم ابھی آپس میں رقابت تھی اور مثل سابق کے اب بھی سرداران مغلیہ پر رشوت ستانی کا گمان تھا، خصوصاً خانخانان کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ دکن کے روپیہ نے اُس کے بازوؤں کو شل اور اس کو نکما کر دیا تھا، چنانچہ سر تھامس رو لکھتا ہے۔[57]

---

۵۱ اقبال نامہ جہانگیری ۶۵

۵۲ تزک جہانگیری ۱۰۷

۵۳ اقبال نامہ جہانگیری ۶۷

۵۴ تزک جہانگیری ۱۰۸

۵۵ تزک جہانگیری ۱۰۸

۵۶ اقبال نامہ جہانگیری ۷۴ تا ۷۸

۵۷ History of Jahangir By Beni Prasad P. 270

اصغر علی محمد علی کی دوکان بہت مشہور ہے

یہ وہ حالات تھے جن کے تحت شہزادہ خرم دکن کی مہم پر نامزد کیا گیا۵۱ تاکہ وہ اس گتھی کو سلجھائے جس میں امرائے نامدار مثل خانخاناں، خانجہان، خان اعظم، عبداللہ بارہہ، مانسنگہ اور آصف خاں کو بھی ناکامی حاصل ہوئی تھی، جہانگیر نے ارادہ کیا کہ شہزادہ خرم کو بطریق اول آگے روانہ کرکے خود بہ نفس نفیس عقب سے روانہ ہو۵۲۔ خود ماندو گیا اور وہاں شکار میں مشغول ہوا، اور خرم کو دکن کی طرف روانہ کیا۵۳۔ شہزادہ خرم، مہابت خان خانخاناں وغیرہ کے ساتھ برہان پور میں داخل ہوا، مخالفین نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ اب نہ رشوت کام آسکتی ہے اور نہ آپس کا نفاق قایم رہ سکتا ہے جس سے وہ اب تک فائدہ اٹھاتے رہے، خرم نے اپنی حسن تدبیر سے اس اتحاد کو جسے عنبر نے قایم کیا تھا توڑ ڈالا، عنبر کی حالت خود اچھی نہ تھی، سلاطین دکن میں اس وقت سوائے عنبر کے کون ایسا منچلا تھا جو مغلیہ فوج کے مقابلہ کو اٹھتا جب اس کی حالت اس قابل نہ تھی تو اس سے بجز اطاعت کے اور کیا ہو سکتا تھا، چونکہ ابراہیم عادل شاہ تمام ملک دکن میں اس وقت بڑا ذی عزت تھا اس واسطے شہزادے نے افضل خاں کو بطور سفیر ابراہیم عادل شاہ کے پاس بھیجا اور راجہ بکرماجیت کو عنبر کے پاس روانہ کرکے لڑائیوں کی خرابی اور اس کے تباہ کن اثرات کو ظاہر کرکے صلح کرنے پر آمادہ کیا، سلطان ابراہیم نے سفیر کا اعزاز و اکرام سے استقبال کیا اور اطاعت کا عہد کیا۔ بالاگھاٹ کا تمام ملک اور قلعہ احمد نگر حوالہ کرکے عنبر نے صلح کی درخواست کی، شاہزادہ خرم کے ایلچی نے ماندو پہنچکر جہانگیر کو یہ خوشخبری سنائی کہ "حدود بادشاہی راکہ عنبر بر اختر متصرف شدہ بود بدستور سابق در تصرف اولیائے دولت قاہرہ باز گذاشتند۵۴" اور خرم کی عرضداشت بھی ملی جس میں اس نے سلطان ابراہیم کو خطاب فرزند عطا کرنیکی درخواست کی تھی چنانچہ جہانگیر نے سلطان ابراہیم کے نام ایک فرمان روانہ کیا اور فی البدیہہ یہ شعر لکھکر فرمان کے عنوان پر لکھدیا؎

شدی از التماس شاہ خرم
بفرزندی ما مشہور عالم۵۵

صلح کے مکمل ہوجانے کے بعد شہزادہ دکن کے انتظام میں مشغول ہوا، خانخاناں کو برار، خاندیس اور احمد نگر کا والی مقرر کیا، اور شاہنواز خاں کو مفتوحہ علاقہ میں متعین کرکے جہانگیر سے ماندو میں ملا۵۶

خرم جب دکن آیا تھا اس وقت قلعہ احمد نگر دشمنوں کے قبضہ میں تھا، بالاگھاٹ کا علاقہ ہاتھ سے جاچکا تھا، خرم نے ان کو دوبارہ حاصل کیا، تاہم اگر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے خانخاناں کے ادھورے کام کی تکمیل ایک عارضی صلح سے کی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کثیر دولت اور بیشمار نقصان جان کے بعد بھی مغلیہ سلطنت کے حدود وہی رہے جو سنہ ۱۶۰۱ء میں تھے، جو کچھ بھی خرم نے کیا وہ یہ تھا کہ اپنے تدبر اور عظیم الشان فوج کے رعب سے دشمن کے دلوں میں ہیبت ڈالدی اور اتحاد کو توڑ دیا۔ اور ایک وقتی صلح کرلی، اگر اس صلح پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ وہ کوئی مستقل صلح نہ تھی جس طرح بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے۵۷۔

۵۱ بساتین السلاطین ۲۷۲
۵۲ تزک جہانگیری ۱۹۶
۵۳ اقبالنامہ جہانگیری ۹۰
۵۴ اقبالنامہ جہانگیری ۱۰۰
۵۵ اقبالنامہ جہانگیری ۱۰۱
۵۶ تزک جہانگیری ۱۹۳
۵۷ History of Jahangir By Beni Parshad, Page 286

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

جب سنہ ۱۰۲۹ھ میں جہانگیر کشمیر میں عادتی گلگشت میں مصروف تھا دکن میں عجیب حالات رونما ہوئے ابراہیم عادل شاہ نے بیدر پر لشکر کشی کی اور بریدیہ خاندان کی آخری امیر کو قید کرکے بیجاپور لے آیا اور قلعہ بیدر اور اس کے تمام توابعات ممالک عادل شاہی میں داخل ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ادہونی کی طرف کچھ فساد ہوا۔ سلطان ابراہیم نے اُس کے اندفاع کے لئے فوج بھیجی جس نے سنہ ۱۰۲۹ھ میں قلعہ کرنول فتح کر لیا، یہ علاقہ بھی عادل شاہی عملداری میں داخل ہو گیا[1]

ملک عنبر کو جب فرصت ملی تو اس نے اپنی فوج اور ملک کا اچھا انتظام کیا جو بڑا غیرت والا شخص تھا۔ نہ صرف اس کو اپنی شکست کا رنج اور علاقجات مفتوحہ کی واپسی کا خیال تھا بلکہ اس کو اس بات کا بھی بڑا صدمہ تھا کہ خرم کے سفیر سب سے پہلے ابراہیم عادل شاہ پاس گئے اور وہیں تمام شرائط صلح طے کئے گئے۔ جب اس کے ملک کا اندرونی انتظام درست ہو گیا تو اس نے فوراً عہد اطاعت کو فراموش کرکے معاہدہ کی خلاف ورزی کی[2]

منتخب اللباب میں لکھا ہے کہ "دست تعدی و غارت بمرتبہ دراز ساختہ کہ تا حوالی برہان پور آبادی نگذاشتہ"[2]۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دوران میں مغلیہ سرداروں کے درمیان پھر نفاق پیدا ہو گیا۔ ملک عنبر نے ان تمام مفید مطلب واقعات سے فائدہ اٹھایا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ سے اتحاد پیدا کیا، اور مقبوضات شاہی پر دھر دوڑا۔ خنجر خاں کو شکست دی، داراب خاں بھی بالاگھاٹ سے ہٹ آیا، گو داراب خاں نے تین لڑائیوں میں شکست دی لیکن اس سے کوئی فائدہ بخش نتیجہ نہ نکلا۔ عنبر نے احمد نگر کا محاصرہ کر لیا، برہان پور (پایہ تخت دکن) بھی معرض خطر میں پڑ گیا۔ مغلیہ سرداروں نے بالاپور میں پناہ لی۔ لیکن عنبر نے اس کے اطراف و اکناف کے حصہ کو تباہ کر دیا، بقول خافی خاں "دکھنیان تاراج کناں از آب نربدا عبور نمودند"[3]

شاہی فوج ایک اور لڑائی میں کامیاب رہی، لیکن اس کا اثر ملک عنبر پر کچھ نہ پڑا۔ اس کا زیادہ تر انحصار میدانی لڑائیوں پر نہ تھا، بلکہ ان تیز سوار وں پر تھا جو کہ عقب اور پہلوؤں سے پریشان کرتے رسد لوٹ لیتے اور موقعہ پا کر چھاپہ مارتے تھے۔ غرضکہ تین ماہ کے اندر مغلیہ احمد نگر کا بڑا حصہ اور برار ملک عنبر کے قبضہ میں چلا گیا[4]۔ اسی عرصہ میں جہانگیر کی خدمت میں عرض داشت پہنچی کہ "دنیا داران دکن سر فتنہ و فساد بر داشتہ اند و پا از اندازۂ خویش برتر نہادہ بسیارے از مضافات احمد نگر و برار متصرف گشتہ اند"[5]۔ جہانگیر نے عرضداشت پہنچنے پر لشکر کے خرچ کے لئے ایک کروڑ روپیہ مقرر کرکے سرداروں کو حکم دیا کہ فوراً مدد کو پہنچیں اور شہزادہ خرم کو دکن کی مہم پر نامزد کیا[5]۔

خرم اچھی طرح جانتا تھا کہ سلطنت میں اس کی کیا منزلت ہے۔ اس وقت وہ سب سے بڑا سپہ سالار تھا، وہ دکن سے پوری طرح واقف تھا۔ اس نے دکن کی طرف روانہ ہونے سے انکار کیا جب تک کہ خسرو اس کے حوالہ نہ کر دیا جائے صاحب ترکتازان ہند لکھتا ہے "تا چہ در دل شاہجہان گذشت کہ گفت کہ من بدکن نمیروم جز آنکہ خسرو را بسپارند"[6] وہ جانتا تھا کہ اب بھی بعض قدیم امرا خسرو کے طرفدار ہیں، اور وہ عوام میں ہر دلعزیز ہے، ممکن ہے کہ نورجہاں خسرو کے ساتھ ہو جائے۔ وقت ایسا نازک تھا کہ جہانگیر نے بادل ناخواستہ حکم دیا کہ "ہمراہ خود بردہ بضابطہ کہ خاطر آن فرزند مطمئن باشد

[1] بساتین السلاطین ۲۸۲ و ۲۸۳
[2] منتخب اللباب جلد اول ۳۰۵
[3] تزک جہانگیری ۳۰۵
[4] منتخب اللباب جلد اول ۳۰۷
[5] تزک جہانگیری ۳۲۱
[6] ترکتازان ہند ۵۲۰
[7] اقبالنامہ جہانگیری ۱۸۶
[8] اقبالنامہ جہانگیری ۱۸۰ تا ۱۸۲

بہترین عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگالیے

مقید دارد"[51]

اجین پہنچکر خرم نے خواجہ ابوالحسن اور بیرم بیگ کو ماندو روانہ کیا تاکہ دشمنوں سے اس کو پاک کریں اسی دوران میں مرہٹوں کو بڑی ہزیمت حاصل ہوئی اور شاہی فوج نے نربدا کے کنارہ تک ان کا پیچھا کیا، شاہزادہ خرم نربدا آگے جنوبی ساحل پر ان سے جا ملا اور برہان پور کی طرف روانہ ہوا۔ دکھنیوں کی فوج میں تزلزل پڑ گیا۔ انھوں نے محاصرہ اٹھالیا اور فرار ہو گئے لیکن ان کا تعاقب کھڑکی تک کیا گیا، عنبر بہت پریشان ہوا اور اپنے آقا و زن و فرزند کو کھڑکی سے نکال کر دولت آباد کے قلعہ میں لیجا کر رکھا، جس قدر رباد شاہی ملک عنبر نے اپنے تصرف میں کر لیا تھا وہ سب شہزادہ خرم کے قبضہ میں آگیا اور ملک عنبر نے اطاعت قبول کر لی۔[52]

غرض شاہجہاں نے چھ مہینے کے اندر اس مہم کو سر کیا، اور اس ملک کے علاوہ جو قدیم سے سلطنت مغلیہ میں داخل تھا "موازی چہار کروہ کہ ور دام دیگر از محال کہ متصل بسرحدہائے پادشاہی است وگذارندو پنجاہ لک روپیہ برسم پیشکش بخزانہ عامرہ رسانند"[53]

اس کی تقسیم یوں ہوئی کہ نظام الملک ۱۲ لاکھ، قطب الملک ۲۰ اور ابراہیم عادل شاہ ۱۸ لاکھ روپیہ بطور پیش کش روانہ کریں، اس مہم کو بحسن و خوبی اختتام تک پہونچانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ خرم کے رعب وداب شہرت و ناموری اور قدر و منزلت میں اور اضافہ ہوا، لیکن واقعات کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ دن تک صلح کے برقرار رہنے کی امید نہیں کی جاسکتی تھی اور نہ اس قسم کی وقتی صلح سے دکھنی سلطنت کی قوت میں کوئی کمی ہوگئی اور نہ وہ عرصہ تک مطیع رہی مستقل صلح نہ ہونے کی وجہ سے ان کو پھر سر اٹھانے کا موقع ملا، شاہجہاں کی یہ غلطی تھی کہ اس نے وقتی صلح پر اکتفا کی اور اس کی کوشش نہیں کی کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے یہ خلش ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے، ایک طرف تو مغلیہ سلطنت برابر حملہ کرتی رہی اور دوسری طرف دکھنی سلطنتیں برابر مخالفت کرتی رہیں اور آسانی کے ساتھ اپنی آزادی کو گنوارا پسند نہ کیا، اس قسم کی غلطی اورنگ زیب کے زمانہ تک ہوا کی جب اورنگ زیب نے ان کے قلع قمع کی کوشش کی اس وقت پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اور ایسی قوت پیدا ہو چکی تھی جس کا استیصال اس کی قدرت سے باہر تھا۔ گو اورنگ زیب نے اس کی تکمیل میں جان دیدی تاہم یہ مقصد حاصل نہ ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسی قوت نے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

موجودہ حالت میں لڑائی کو جلد ختم کرنے میں خرم کا ایک خاص مقصد مضمر تھا، وہ یہ کہ نورجہاں کی فتنہ پردازی اور شورش پسندی گل کھلا رہی تھی جسکی وجہ سے محال متعلقہ خرم شہریار کی جاگیر میں دیدیا گیا تھا اور اس کے عوض صوبہ دکن اور گجرات و مالوہ جہاں وہ چاہے اس کو جاگیر دیجا رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر خرم اس سے ناراض ہو کر شورش کرے تو جہانگیر کو اس کی بغاوت کا یقین دلا کر باپ بیٹے کے تعلقات کشیدہ کر دیے جائیں۔ نتیجہ یہی نکلا کہ خرم جان کے خوف سے دکن کی طرف بھاگ گیا اور جہانگیر نے سلطان پرویز کی سرداری میں مہابت خان کو اتالیق کر کے

[51] اقبالنامہ جہانگیری ۱۸۳

[52] اقبالنامہ جہانگیری ۱۸۰ و ۱۸۲

[53] اقبالنامہ جہانگیری ۱۸۳

[54] اقبالنامہ جہانگیری ۱۹۳ تا ۱۹۶!

اصغر علی محمد علی کی دوکان بہت مشہور ہے

خرم کے تعاقب میں فوج روانہ کی، خرم نے مانڈو پہنچکر فوج کو آراستہ کیا،[51] یہ کس قدر افسوس کی بات ہے اور کس قدر عبرت کا مقام کہ مغلیہ سلطنت کا دکھنی پایہ تخت جہاں سے خرم دشمنوں کے مقابلہ کیلئے نکلا کرتا تھا اور جہاں اُسکو شاہانہ اختیارات حاصل تھے وہیں اُس کی حالت نازک ہو گئی یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہی خرم جو ملک عنبر کا جانی دشمن تھا نیرنگی تقدیر سے اس پرانے رقیب سے تعلقات پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن دوراندیش اور تجربہ کار سپہ سالار نے بغیر ابراہیم عادل شاہ کی رائے دریافت کئے اتحاد کرنے سے انکار کیا، اور ابراہیم نے ایلچی کو بہت لیت و لعل میں مبتلا رکھا اور کوئی امداد دینے کا قطعی عہد نہ کیا، جب شاہجہاں نے اپنا مستقبل بالکل تاریک دیکھا تو ۱۰۳۲ھ میں بنگال کا رخ کیا اور قطب شاہی عملداری میں سے ہوتا ہوا مچھلی پٹن پہنچا[52] سلطان محمد قطب شاہ نے نہایت خاطر داری کی اور نقد وجنس اور غلہ سے امداد کی[53]

دکن میں چند در چند واقعات ظہور پذیر ہو چکے تھے، ملک عنبر خاص مقصد کے حاصل کرنے کے لئے سلطان ابراہیم عادل شاہ کے متواتر احسانات فراموش کر کے بیجاپور عملداری پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ جس کی وجہ سے ابراہیم عادل شاہ اُس کی مدافعت کے لئے مغلیہ امداد حاصل کرنا چاہتا تھا اسی بنا پر جب اس نے شہنشاہی فوج کو خرم کا مخالف دیکھا تو خرم کا ساتھ دیکر شہنشاہ سے مخالفت مول لینا پسند نہ کیا، جب جہانگیر کو یہ خبر ملی کہ خرم بنگالہ گیا ہے تو پرویز اور مہابت خاں کو دکن کا بندوبست کر کے بنگالہ جانے کے لئے لکھا، دکن کا بندوبست بغیر دکھنی سرداروں کی اعانت کے نہیں ہو سکتا تھا۔ مزید براں اس وقت ابراہیم عادل شاہ اور عنبر دونوں چاہتے تھے کہ سلطنت مغلیہ کو اپنا طرفدار بنائیں، ملک عنبر نے نہایت عجز و فروتنی سے یہ عرضداشت بھیجی کہ وہ ہمیشہ اطاعت گذار اور فرمانبردار رہیگا چنانچہ شاہی خدمت کے لئے اپنے بیٹے کو پیش کیا، ابراہیم عادل شاہ نے بھی فرمانبرداری اور دلنوازی کا عہد کیا اور محمد لاری کو پانچ ہزار سوار کے ساتھ شاہی خدمت کیلئے بھیجنے کا وعدہ کیا۔[54]

بالآخر مہابت خاں "جانب عنبر را از دست داد و بکام روائی عادل خان پرداخت"[55] حسب معاہدہ محمد لاری پانچہزار سوار کے ساتھ شاہی خدمت میں داخل ہو گیا۔ ملا محمد لاری اور سربلند رائے کو برہان پور میں چھوڑ کر مہابت خاں معہ شہزادہ پرویز بنگالہ کی طرف روانہ ہوا، ملک عنبر اس اتحاد سے خوف زدہ ہو کر مرتضیٰ نظام شاہ کو معہ اہل و عیال کھڑکی سے نکال کر دولت آباد کے مضبوط قلعہ میں بھیجدیا، اور قندھار جو سرحد گولکنڈہ پر واقع تھا اُس کی طرف بڑھا اور مشہور یہ کیا کہ قطب الملک سے اپنا معمولی روپیہ لینے جارہا ہے[56] وہاں پہنچکر اس نے دو سال کا خراج وصول کیا اور قطب الملک سے اتحاد کر کے بیدر کی طرف لوٹ کر بیجاپور کی طرف کوچ کیا، اور ابراہیم عادل شاہ کو گھیر لیا، ابراہیم عادل شاہ کی چیدہ چیدہ فوج ملا لاری کے ماتحت برہان پور میں تھی اور کچھ جنوب کی طرف گئی ہوئی تھی، ابراہیم سے اس وقت کچھ بھی نہ ہو سکا، بہ امر مجبوری قلعہ میں پناہ گزیں ہوا، اور دو آدمیوں کو ملا محمد لاری اور سربلند رائے صوبہ دار برہان پور کے پاس بھیجا اور بادشاہی امر کو اپنی فرمانبرداری و اطاعت گذاری کا واسطہ دیکر امداد کا خواہاں ہوا۔[57] جب عنبر کو اس کی خبر ملی تو اُس نے یہ عرضداشت بھیجی کہ میری و ابراہیم عادل شاہ کی دیرینہ دشمنی ہے اور اس وقت ملک کے کچھ حصہ کے متعلق ہمارے درمیان نزاع ہے لہٰذا "مرا با او وا گذارند تا ہر چہ بہ مشیت است بہ ظہور آمد"[58] لیکن اس سے کوئی

---

[51] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۱۹۸

[52] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۲۱۲

[53] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۲۱۵

[54] تزک جہانگیری صفحہ ۳۸۱

[55] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۲۲۳

[56] تزک جہانگیری صفحہ ۳۸۶

[57] تزک جہانگیری ۳۹۱ اور اقبال نامہ جہانگیری ۲۳۴

[58] اقبال نامہ جہانگیری ۲۳۶

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

مفید نتیجہ نہیں نکلا، سر بلند رائے نے لشکر خاں اور محمد لاری کو بیجاپور کی طرف روانہ کیا، جب عنبر نے اس عظیم الشان فوج کو دیکھا تو کئی مہینے کے محاصرہ کے بعد بیجاپور کو چھوڑ کر اپنے وطن کی طرف روانہ ہوا، جہانگیری اور عادل شاہی فوج نے اُس کا تعاقب کیا اور اُسے بجد تنگ کیا عنبر بعجز و زاری جہانگیری امراسے معافی کا خواستگار ہوا لیکن انہوں نے اس کے کہنے کی سماعت نہیں کی اور اُس کے شرائط صلح کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ آخر بہ تنگ آمد و بجنگ آمد" عنبر نے بھی جان توڑ کر کوشش کی جب مغلیہ اور عادل شاہی لشکر حوالی احمد نگر میں پہنچا تو عنبر اپنا قابو چلتا دیکھکر فیلان جنگی اور توپخانہ لیکر مقابل ہوا، مقام بھتوری پر اچانک حملہ آور ہوا اور اس متفقہ فوج کو کامل شکست دی، ملا محمد لاری مارا گیا۔ جہانگیری اور عادل شاہی فوج فرار ہو گئی، بڑھے ہوئے حوصلوں کے ساتھ اس نے احمد نگر کا محاصرہ کیا۔ جب یہاں کامیاب ہوتا ہوا نظر نہ آیا تو پھر بیجاپور کی طرف روانہ ہوا، ابراہیم عادل شاہ دوبارہ قلعہ نشین ہوا، عنبر نے دوبارہ محاصرہ میں سختی کی، ابراہیم عادل شاہ کے ملک کا ایک بڑا حصہ قلمرو نظام شاہی میں داخل کیا۔[۵۱] نورس پور جس کو سلطان نے نہایت شوق سے بنایا تھا اور جس کی شہر پناہ ابھی مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور بالکل مسمار کر دیا۔[۵۲] اس کے بعد یعقوب خاں حبشی کو دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ عنبر نے برہان کی طرف روانہ کیا، اور جہانگیری علاقوں پر دست درازی شروع کر دی۔ اور اسی زمانہ میں ملک میدان توپ اور جہانسوز توپخانہ کے ساتھ شولاپور کا محاصرہ کیا اور اُسے فتح کر لیا جو ایک عرصہ دراز سے نظام الملک اور عادل شاہیوں کے درمیان متنازعہ فیہ تھا۔[۵۳] انہیں حالات میں شہزادہ خرم نے اوریسہ، تلنگانہ اور گولکنڈہ ہوتے ہوئے نظام الملک کی قلمرو میں قدم رکھا، ملک عنبر نے بہت پرجوش اور شاندار استقبال کیا۔ اس لئے کہ اب یہ دونوں شہنشاہی حکومت کے خلاف تھے، نیرنگی قسمت کا تماشہ ملاحظہ ہو کہ دو جانی دشمنوں کے درمیان اسقدر قریبی تعلق پیدا ہوا، دونوں کی متفقہ فوج برہان پور کی طرف روانہ ہوئی اور قلعہ کا محاصرہ کیا اور اُس میں بجد سختی شروع کر دی چند ہی مہینوں میں برہان پور دشمنوں کے قبضہ میں چلا جاتا، لیکن واقعات نے پلٹا کھایا، پرویز اور مہابت خاں فاتح فوج کے ساتھ داخل ہوئے، خرم اٹھاکر رہتن گڑھ کی طرف روانہ ہوا۔[۵۴]

شہزادہ خرم آئندہ یا مستقبل کے متعلق بہت پریشان تھا، اس کے تمام ہوا خواہ اور نامی گرامی امرا ایک ایک کرکے یا تو فوت ہو چکے تھے یا جنگ میں کام آ چکے تھے اور اُس نے جب دیکھا کہ دکن میں بھی کہیں امن حاصل نہیں تو بوجوہات چند در چند آخر کار ۱۶۲۶ء میں جہانگیر سے معافی مانگ لی، شرائط صلح یہ تھے کہ شاہجہاں اپنے دو بیٹے دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو دربار شاہی میں بھیجدے اور قلعہ اتھاس و آسیر ملازمان شاہی کے حوالہ کر دے شاہجہاں مجبوراً راضی ہوا۔[۵۵] بہر حال باپ بیٹے میں ملاپ ہو گیا۔

نورجہاں کی مخالفت کی وجہ سے مہابت خاں دکن سے بلا لیا گیا اور اُس کی جگہ خانجہاں لودی دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ شمالی ہند میں مہابت خاں اور نورجہاں کی مخالفت کی وجہ سے ابتری پھیل گئی تھی۔ اُن کی آپس کی نا اتفاقی اور مخالفت سے فائدہ اٹھانیوالا

---

۵۱ تزک جہانگیری صفحہ ۲۹۲

۵۲ بساتین السلاطین صفحہ ۲۷۴

۵۳ اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۲۳۸

۵۴ اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۲۴۴

۵۵ تزک جہانگیری ۳۹۰

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

ملک عنبر بھی سنہ ۱۰۳۵ھ میں انتقال کر گیا۔[1] عنبر کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا فتح خاں ولی اور یاقوت خاں سپہ سالار مقرر ہوا، یہ دونوں گفت شنید کا سلسلہ جاری کر کے مغلیہ حکومت کا اقتدار ماننے والے ہی تھے کہ احمد نگر میں ایک انقلاب ہوا، اور حمید خاں حبشی نمایاں ہوا جس نے فوراً سلطنت مغلیہ سے اعلان جنگ کر دیا۔ شاہجہاں نے وہی لشکر خاں کو برہان پور میں متعین کر کے جرار کے فوج کے ساتھ کھڑکی کی طرف روانہ ہوا، تاکہ اُس کی گوشمالی کرے لیکن دکن کے زر نے اِسے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ تین لاکھ ہون کے عوض بالا گھاٹ کا تمام علاقہ فروخت کر ڈالا صرف سپہ دار خاں قلعہ دار احمد نگر نے قلعہ کے حوالہ کرنے سے انکار کیا۔

ملک عنبر نے سلطان ابراہیم عادل شاہ کو اس قدر تنگ کیا تھا کہ وہ اس کا بدلہ لینے کیلئے موقع کا متلاشی تھا، تاکہ نظام شاہی عملداری کو تباہ و برباد کر ڈالے، جب ملک عنبر کی وفات کے بعد اس نے دیکھا کہ اب نظام شاہیوں میں کوئی عنبر سا سپہ سالار نہیں ہے تو اپنے ہاتھ سے گئے ہوئے علاقہ کو واپس لینے کے لئے نظام شاہی عملداری کی طرف کوچ کیا، لیکن قسمت ہی مخالف تھی شکست کھا کر واپس ہونا پڑا۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ نے ۹ محرم الحرام سنہ ۱۰۳۷ھ میں انتقال کیا۔ اس کی وفات کے چند ہی مہینے بعد جہانگیر نے بھی رحلت کی شمالی ہند کے تخت پر ایک نیا بادشاہ جلوہ افروز ہوا اور بیجاپور میں سلطان محمد عادل شاہ تخت نشین ہوا۔

ہم آئندہ مضمون میں شاہجہاں کے عہد حکومت میں شمالی ہند اور دکن کے درمیان جو تعلقات رہے اُس پر بحث کریں گے۔

سعیدی بی۔ اے (علیگ)

تصنیفات مولانا نیاز فتحپوری

صحابیات عہ

تاریخ الدولتین عمہ

گہوارۂ تمدن عہ

نگارستان عہ

شہاب کی سرگزشت عمہ

اگر آپ یہ نو روپیہ کی کتابیں آٹھ روپیہ میں خریدنا چاہتے ہیں تو آٹھ روپیہ کا آج ہی منی آرڈر کر دیجئے وی۔ پی طلب کرنے پر علاوہ محصول نو روپیہ میں بھیجی جائینگی

مینجر نگار بھوپال

ضرورت ہے

اگر آپ کو خیمے۔ دریاں اور چرمی سامان کی تو فوراً ہمیں ایک کارڈ لکھیے۔ ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزاں ملتا ہے والی ریاست بڑے بڑے رؤسا ہمارے ہی یہاں سے مال منگاتے ہیں فہرست اردو یا انگریزی کی منگا کر ملاحظہ فرمائیے ہمارا کارخانہ صداقت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا ہے۔

المشتہر

محمد حسین اینڈ کو ٹینٹ مرچنٹ فتح گڈھ۔ یو۔ پی

[1] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۲۷۱ اور تزک جہانگیری صفحہ ۴۰۹

جانِ عالم اور ملکہ مہرنگار

(افسانہ)

"معاذ اللہ"

یہ تھا سب سے پہلا وہ لفظ جو ایک نوجوان لڑکی کو دیکھ کر اسلم کے منھ سے نکلا، بعض الفاظ ایسے ہیں جو اپنی صوتی خصوصیت کے لحاظ سے بھی کسی خاص جذبہ کی مکمل تصویر پیش کردیتے ہیں، اور اس اصول پر اسلم نے حسن کی یہ تین قسمیں کی تھیں:-

اول:- وہ جسکو دیکھنے کے بعد بے اختیار "واہ" منھ سے نکل جائے۔

دوسرے:- وہ جس پر نگاہ پڑتے ہی "سبحان اللہ" کہنے پر انسان مجبور ہو جائے۔

تیسرے:- وہ جو مجبوراً زبان سے "معاذ اللہ" کہلوائے۔

اسلم اپنی افتادِ طبیعت کے لحاظ سے افادی نہیں بلکہ استفادی انسان تھا وہ چاہتا تھا کہ ہر چیز کا شیریں حصہ خواہ اس کے لیے کتنی ہی مادی قربانی کیوں نہ کرنی پڑے اسی کو ملے۔ اور تلخ اجزا دوسروں کے لیے چھوڑ دے۔ اپنی گزشتہ حیاتِ شباب میں جس کی مدت کم و بیش دس سال سمجھنی چاہیے۔ اس کو سیکڑوں ہی بار "واہ" قسم کے حسن سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ اور بیسیوں مرتبہ جمال "سبحان اللٰہی" کے حضور میں بھی جبین نیایش جھکا چکا تھا لیکن "حسن معاذ اللہ" کا صرف ایک واقعہ اُسے یاد تھا جب اس نے ۱۹۱۰ء کی نمایش الہ آباد میں صرف مطالعۂ جمال کی غرض سے مخصوص طور پر ریشمی و زرکار ساریوں کی دوکان قائم کی تھی۔ ہر چند اس کاروبار میں اس کو سخت نقصان ہوا ——— اور حسن کے ساتھ وہ کون سا کاروبار ہے جس کا نتیجہ تباہی نہیں ہوتا۔ لیکن جب میں نے ایک مرتبہ اس کو اس حماقت پر ملامت کی تو بولا:-

"سنو! ——— بسنت کا زمانہ ہے جاڑے کا غیر شاعرانہ موسم جو رعنائی و شباب کا دشمن ہے، ختم ہو رہا ہے۔ موسم بہار کی ہلکی گرمی نے خون کو رقیق کرکے رخساروں سے ہولی کھیلنا شروع کردی ہے۔ حسن سبک ریشمی ملبوس اختیار کرکے نمودِ شباب کے ناجائز حجابات کو دور کرتا جاتا ہے۔ ہر ہر قدم پر نرم آنچل شانہ سے سرک سرک کر نگاہوں کو جوانی کا رازدار بنا رہا ہے۔ شام کا وقت ہے، ہوا پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی شام میں سکر کی سی کیفیت پیدا کر رہی ہے۔ شفق کی رنگینی چہروں پر ہلکا ہلکا عبیر ملتی جاتی ہے۔ نمایش گاہ میں جسے میں نے ہمیشہ اپنی زندگی کا ایک بہترین خواب سمجھا، لاکھوں برقی قمقموں نے سیلاب نور جاری کر رکھا ہے، فضا اپنے تمام ماحول سے متاثر ہو کر ایک قہقہۂ رنگیں بنی ہوئی ہے حسن و شباب اپنی آرایش زنگار رنگ سے سڑکوں کو متحرک قوس قزح بنائے ہوئے ہیں اور روش پر ابرک کے ذرے جب ان کی رفتار سے منتشر ہوتے ہیں تو بجلی کی روشنی میں ایسا نظر آتا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کے عطر ملتا ہے

ٹھوکر زمین سے چنگاریاں پیدا کر رہی ہے۔ یا سیکڑوں جگنو پامال ہونے کے لیے ان کے قدموں سے لپٹے جا رہے ہیں، الغرض یہ موسم ہے، یہ وقت ہے، یہ عالم رنگ و بو ہے، کہ ساری نمائش گاہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید پر لگا کر اُڑنے والی ہے، اور میں حالت سکر میں ـــ تشبیہ و استعارہ نہیں بلکہ واقعی حالت سکر میں ـــــ اپنی دوکان کے سامنے بیٹھا ہوں کہ ناگہاں ایک تلاطم نور، ایک سیلاب رنگ ایک طوفان حسن و شباب یعنی ایک عورت، مکمل عورت، تمام نازک ترین خصوصیات نسائی لیے ہوئے دوکان کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے، ایک ایسے غرور و پندار کے ساتھ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دنیا کی ہر ہر چیز وہ اپنی مملوکہ سمجھتی ہے دیوار پر لٹکی ہوئی ساریوں کو آ کر دیکھنے لگتی ہے۔ میں جب تک آگے بڑھوں وہ تیتری کی طرح اِدھر اُدھر پھر کر ایک آسمانی رنگ کی بنارسی ساری پر اپنا ہاتھ رکھ کر میری طرف دیکھتی ہے، یعنی قیمت دریافت کرتی ہے، میں بڑھ کر گویا یہ دیکھنے کے لیے کہ کس قیمت کی ساری ہے اس کا کونہ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں اور عالم سرشاری میں اسکے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہوں وہ چونک پڑتی ہے میں معذرت کرتا ہوں کہ معاف فرمائیے میں نے تو آپ کے ہاتھ کو بھی ساری ہی کا کوئی زر کار بوٹہ سمجھا تھا وہ یہ سن کر شرما جاتی ہے، اور بجائے ساری کے میرے دل کا سودا ہو جاتا ہے۔

ـــــ اب آپ ہی بتائیے کہ مجھ سے زیادہ فطرت ناشناس اور احسان فراموش کون ہو سکتا تھا اگر میں قدرت کے اس عطیہ کی قدر نہ کرتا۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ میری دوکان کا اکثر حصہ اسی کے نذر ہو گیا لیکن میں آج بھی اس پر فخر کر سکتا ہوں کہ اس نے میری تباہیاں بہت گراں قیمت پر خریدیں ـــــ"

اسوقت جب اس لڑکی کو دیکھکر اسلم نے معاذ اللہ کہا تو میں سمجھ گیا کہ اب ضرور اس کی شرارتیں عود کر آئیں گی۔ اس لیے میں نے چاہا کہ اس کے خیال کو کسی اور طرف منتقل کر دوں۔ لیکن وہ کیا ماننے والا تھا، برابر خاموشی سے جانے والی کا نگاہوں سے تعاقب ہو گیا۔ اور جب وہ دوسری سڑک پر مڑ گئی تو چند لمحے ساکت رہنے کے بعد مجھ سے بولا کہ "بتائیے، اب کیا کروں"

میں نے ہنسکر جواب دیا کہ "سوائے صبر کے کیا چارہ ہے"

یہ سنکر اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور بولا کہ "شاید آپ کو علم نہیں، میں حسن سے ایک بار متاثر ہونے کے بعد اسوقت تک کس درجہ سنجیدہ رہتا ہوں جب تک وہ مجھے مل نہ جائے۔ لیکن اس سے تو آپ ضرور واقف ہوں گے کہ ایک سنجیدہ انسان مذاق کو پسند نہیں کرتا۔ آج مجھے بمبئی آئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے اور یہ زمانہ اسقدر خشک و بے مزہ بسر ہوا ہے کہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس موقع کو ہاتھ سے جانے دینا گوارا نہیں کر سکتا، اس لیے میں واقعی پوچھتا ہوں کہ بتائیے یہ کون تھی ـــــ میں نے کہا "پاگل ہوئے ہو بمبئی کوئی تمہارا گاؤں جلال آباد تو ہے نہیں۔ کہ ہر شخص ساری آبادی سے واقف ہو، یہاں تو محلہ کے ہمسایہ بلکہ ایک ہی مکان کے دو رہنے والے بھی ایک دوسرے سے برسوں واقف نہیں ہوتے"

اسلم نے یہ سُنکر تھوڑے سے تامل کے بعد کہا کہ "اچھا تو آپ گھر چلیے، اور مجھے تھوڑی دیر کے لیے آزاد کر دیجیے۔ میں آپ سے کسی وقت آکر مل جاؤنگا۔ یہ کہکر وہ آگے بڑھا اور کرایہ کے موٹر پر بیٹھکر روانہ ہو گیا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر نہایت نفیس ہے

—(۲)—

اسلم نہایت دولتمند خاندان کا لڑکا تھا، اس لئے جب وہ کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر نکلا تو اس نے اپنے مستقبل کے لیے تجارت کو پسند کیا اور اس فن کو سیکھنے کے لیے امریکہ چلا گیا۔ اس نے چار برس یہاں قیام کیا اور اس زمانہ میں اس نے تجارت کے متعلق جسقدر معلومات حاصل کیں وہ شاید اسے زیادہ نہ تھی کہ "فن تعشق" کے لیے بڑے سے بڑے سرمایہ کو برباد کر دینا بڑے نفع کا سودا ہے۔"

وہ فطرت کی طرف سے حد درجہ بے چین اور چلبلی طبیعت لیکر آیا تھا، اور لطف و نشاط کی جستجو کے سوا اُسے کوئی اور مشغلہ پسند نہ آتا تھا، تعلیم کے دوران میں بھی اس کی زندگی اسی طرح بسر ہوئی کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے کسی پروفیسر نے اس کی طرف سے یہ خیال قائم نہیں کیا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد وہ کوئی "سوچنے والا" انسان بن سکے گا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بے انتہا ذہین تھا، اور اسی ذہانت کی بدولت باوجود اس کے کہ اس نے نہ کبھی غور سے کوئی لکچر سنا اور نہ کسی کتاب کا مطالعہ کیا، وہ گریجویٹ بھی ہو گیا تھا، لیکن اس کی ذہانت صرف اس کوشش میں صرف ہوتی تھی کہ وہ اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ سطحی خواہش کو بھی مضمحل نہ دیکھ سکے —— ایک دن پروفیسر صدیقی کے ہاں دعوت بھی کالج کے پروفیسر اور اکثر سینیر طلبہ جمع تھے، مختلف مباحث پر گفتگو ہو رہی تھی کہ انسان کے مستقبل کا ذکر آیا۔ اور اس سلسلہ میں جب اسلم سے دریافت کیا گیا کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے تو اُس نے نہایت آزادی سے کہدیا کہ "میں تو اوباش بننا چاہتا ہوں"

اسوقت گفتگو نہایت سنجیدگی سے ہو رہی تھی۔ لیکن اسلم کے اس مختصر سے فقرہ نے صحبت کا رنگ بدلدیا۔ اور ہر شخص تفریح و تفنن کے لیے آمادہ ہو گیا۔

پروفیسر صدیقی نے حیرت سے پوچھا کہ "اوباش کسے کہتے ہیں" اسلم نے کہا کہ "آپ نے تو اس قدر استعجاب سے پوچھا گویا یہ کوئی بہت بری بات ہے اس لیے قبل اس کے کہ میں اوباش بنوں آپ مجھے اس کا صحیح مفہوم تو بتا دیجیے۔ ممکن ہے یہ اس قدر خراب بات ہو کہ میں بھی اس سے احتراز کرنے لگوں"

صدیقی نے کہا کہ "بھائی ہماری زبان اور ہمارے محاورہ میں اوباش اُس شخص کو کہتے ہیں جس کے اخلاق نہایت ذلیل ہوں جسے عزت و آبرو کا پاس نہ ہو اور جس کے وجود سے نظام تمدن کو نقصان پہونچے" —— اسلم نے یہ سُنکر کہا کہ "پروفیسر صاحب معاف فرمایئے۔ آپ نے تو بالکل علمی زبان میں معلمانہ انداز بیان سے اس کی صراحت کی جس کو میں نہیں سمجھ سکتا، نظریے اور نتائج صرف کتاب ہی کے اوراق پر اچھے معلوم ہوتے ہیں، آپ تو مہربانی فرما کر صاف صاف الفاظ میں علمی دنیا کی مثالیں دیکر سمجھایئے"

صدیقی —— "مثلاً جھوٹ بولنا، شراب پینا، عورتوں سے ناجائز واسطہ رکھنا، فریب دینا، والدین کی اطاعت نہ کرنا، اہل ... کو تکلیف دینا، لوگوں کے حقوق ادا نہ کرنا، اور اسی طرح کی وہ تمام باتیں جن سے یہ معلوم ہو کہ ان کے مرتکب کو خدا کا کوئی ڈر نہیں ہے اوباشی میں داخل ہے"

یہ سُنکر اسلم بہت ہنسا، اور بولا "میں تو ڈر رہا تھا کہ خدا جانے آپ کیا کیا کہیں گے، لیکن اگر اوباشی صرف اسی کا نام ہے تو مجھے یہ کہتے ہوئے کہ میں اوباش بننا چاہتا ہوں شرم آتی ہے۔ یہ باتیں تو میرے عزائم سے کہیں فروتر ہیں، اور میں اوباشی کا مرتبہ جس کا صحیح مفہوم شاید انگریزی لفظ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگایئے

(Adventure) سے ادا ہو سکتا ہے، اس سے بہت زیادہ بلند سمجھتا ہوں، آپ کی شرطوں میں سے بعض تو میری سمجھ ہی میں نہیں آئیں، مثلاً حقوق ادا نہ کرنا، کہ ابھی تک یہی متحقق نہیں ہوا ہے کہ حقوق کس بلا کا نام ہے، یا خدا سے ڈرنا کہ اس وقت تک خدا سے ڈرنے کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی جس طرح وہ مجھے مار ڈالنے والا ہے، اسی طرح ایک دن وہ بغداد کے سجادہ نشین صاحب کو بھی ہلاک کر دے گا پھر ڈرنے کا نتیجہ۔ اسی طرح والدین کی اطاعت نہ کرنا، اور فریب دینا ہے، کہ خدا معلوم آپ اطاعت اور فریب کس کو کہتے ہیں۔ رہا اہل وعیال (اس کمرہ یہ لفظ کو زبان سے ادا کرتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی ہے) کو تکلیف دینا سو میرے نزدیک وہ شخص اوباش بھی نہیں سکتا جس نے ایک مرتبہ اہل وعیال کر کے اس غیر اوباشانہ حرکت کا ارتکاب کر لیا ہو۔ رہ گیا جھوٹ بولنا اور شراب پینا۔ سو ان میں سے ایک دنیاوی تدابیر میں داخل ہے اور دوسرا انعامِ قدرت کے علمی مطالعہ میں۔ بہر حال آپ نے اوباشی کی تعریف وہ نہیں کی جو میں سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک اوباشی نام ہے صرف اس احساس کا کہ جوانی پھر دوبارہ نہیں آسکتی۔

صدیقی:- "مگر یہ احساس تو ہر شخص کو ہوتا ہے اور مجھے بھی ہے"

اسلم:- "آپ کو بھی ہوگا، لیکن آپ اس احساس کے بعد ٹھنڈی سانس بھر کر بیٹھ جاتے ہوں گے یا زیادہ سے زیادہ اپنی خادمہ زلفن پر خفا ہونے لگتے ہوں گے، لیکن میرے اندر تو یہ احساس ایک مستقل جنون ہے، اور میں اس قدر حریصانہ انداز سے جوانی کے ایک ایک لمحہ پر مہر دوام ثبت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ اگر تم صرف ایک دن کی ناکامی گوارا کر لو تو ساری دنیا مسلمان ہوئی جاتی ہے، تو میں کہوں گا کہ تم تو خدا کیلئے سارے جہان کو کافر بنا دو اور میری جوانی کا ایک لمحہ اور بڑھا دو۔

ممکن ہے کہ اُس وقت اسلم کی یہ گفتگو صرف بطف و تفریح رہی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ تھا وہ کچھ اسی خیال کا انسان اور امریکہ جانے سے پہلے اور واپس آنے کے بعد اس نے جو کام بھی کیا اس جذبہ سے خالی نہ تھا۔ چونکہ وہ حسین بھی تھا شائستہ و مہذب بھی تھا۔ ان تمام اداؤں کا ماہر تھا جو مختلف موقع و محل مرتبہ و مدارج کے لحاظ سے ایک عورت کو مانوس کرنے کے لیے صرف کی جاتی ہیں۔ اس نے شاید ہی کوئی واقعہ اس وقت تک کی زندگی میں ایسا اٹھایا ہو جو اس کی ناکامی کی مثال میں پیش کیا جا سکے۔

اس نے ہمیشہ تجارت کی اور ہمیشہ روپیہ تباہ کیا، لیکن چونکہ دولت کافی تھی اس لئے ابھی تک کوئی سبق دینے والا تلخ تجربہ حاصل نہ ہوا تھا اب بھی حضرت گنج لکھنؤ میں اس کی ایک بڑی دکان آلات موسیقی کی موجود تھی۔ اور اسی سلسلہ سے وہ بمبئی آیا تھا کہ وہ اجنبی لڑکی اُسے نظر آگئی اور دیوانہ وار اس کے تعاقب میں نکل گیا۔

(۳)

میں نے ساری رات اسلم کا انتظار کیا، لیکن وہ نہ آیا۔ صبح مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا تھا اس لیے ملازم کو ضروری ہدایتیں کر کے چلا گیا۔ اور شام کو واپس آیا، لیکن اسلم اب تک گھر نہ آیا تھا، میں اب فکر مند ہو چلا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیونکر اس کا پتہ چلانا چاہیے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر نہایت نفیس ہوتا ہے

کہ دفعتہً دروازہ کھلا اور حضرت نہایت خوش خوش داخل ہوئے۔ میں حقیقتاً اس سے بہت برہم تھا اور چاہتا تھا کہ اس کو سخت ملامت کروں لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا وہ سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا کہ خدا کے لیے میری داستان سُن لیجیے اگر اس سے آپ کو لطف نہ آئے تو پھر جو سزا جی میں آئے مجھے دیجیے۔

اس کی اس ادا پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ اور میں نے کہا کہ "داستان واستان میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھان کر آئے ہوگے"

اسلم ——— "میں خاک چھان کر آیا ہوں۔ میری حالت دیکھیے"

اب جو میں نے غور سے دیکھا تو واقعی اس کی صورت بہت پُررونق تھی۔ داڑھی بالکل صاف تھی، ترچھی مانگ سیاہ بالوں کے درمیان نہایت نمایاں طور پر چمک رہی تھی۔ بوٹ جگمگا رہا تھا، سوٹ بھی نہایت احتیاط سے برش کیا ہوا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اب آراستہ ہو کر گھر سے باہر جانے والا ہے،

میری بڑھتی ہوئی حیرت کو دیکھ کر وہ پھر شوخ انداز سے ہنسا اور میرے پاس بیٹھ کر بولا کہ "آپ اپنی طرف سے لکھنؤ ایک خط لکھ دیجیے کہ اسلم نہایت ضروری کام سے امریکہ چلا گیا ہے اور وہاں کئی مہینے صرف ہوں گے، کاروبار کے متعلق تمام ہدایتیں میرے پاس چھوڑ گیا ہے، اس لیے جو کچھ دریافت کرنا ہو مجھ سے پوچھتے رہو۔ اور روزانہ حساب کی تفصیل بھیجتے رہو۔ اسلم کی والدہ کو اطلاع نہ ہونے پائے"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "کیا واقعی تم امریکہ جا رہے ہو" اسلم مسکرا کر بولا کہ "امریکہ تو نہیں جا رہا ہوں لیکن ابھی کئی مہینہ تک لکھنؤ نہیں جا سکتا، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہاں سے یہاں کوئی آئے۔ اس لیے یہی بہانہ مناسب ہے،

——— "تم آخر لکھنؤ کیوں نہیں جانا چاہتے؟"

——— "اس لیے کہ میں نے یہاں ملازمت کر لی ہے"

——— "ملازمت! اس کے کیا معنی؟"

——— "آپ یقین کیجیے کہ میں نے نوکری کر لی ہے، اور ہر چند یہ میری زندگی کا بالکل نیا تجربہ ہے لیکن اس قدر پُرلطف ہے کہ میں اس سے کسی طرح باز نہیں آسکتا،

——— "کچھ تفصیل تو بیان کرو کہ یہ کیا قصہ ہے۔ تم ایک عورت کی جستجو میں نکلتے ہو اور شام کو ملازم ہو کر واپس آتے ہو؟"

——— "جناب اگلے زمانہ کے لوگ تو محبت میں عمر بھر کا خط غلامی لکھ دیتے تھے اور آپ کو چند روز کی عارضی ملازمت کرنے میں بھی تعجب ہے"

میں اس کی مہمل و مجمل گفتگو سے پریشان ہو کر اُٹھ بیٹھا، اور بولا کہ "خدا نے تمھیں فارغ پیدا کیا ہے، جتنا چاہے سخن آرائی کرو مجھ غریب کو اتنی فرصت کہاں کہ گھنٹوں بیٹھ کر تمہارے معمے حل کرتا رہوں، کہنا ہے تو صاف صاف کہیے ورنہ میں جاتا ہوں مجھے ضروری کام ہے"

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے جو چیز خلاف فرمائش پہونچے فوراً واپس کر کے اپنی پوری قیمت یا بدلے میں دوسری چیز منگا لیجیے واپسی کا محصول بھی آپ کو دینا ہوگا

اسلم نے یہ سُنا اور بالکل غیر متاثرانہ انداز سے بولا کہ "اچھا جائیے، لیکن لکھنؤ کو تو خط لکھدیجئے"

اس کے جواب پر مجھے اور غصہ آیا۔ اور بولا "تو پھر تم صاف صاف نہ بتاؤ گے؟"

——— "بتاؤنگا کیوں نہیں، لیکن آپ سنتے کب ہیں؟"

——— "سن تو رہا ہوں"

——— "اچھا تو سنئیے کہ کل شام کو کرافرڈ مارکیٹ کے قریب میں نے اُس کو پکڑ لیا، اور موٹر چھوڑ کر اُس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ وہ سیدھی سینما ہاؤس گئی۔ اور میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر داخل ہوا (درمیان کی غیر ضروری کڑیاں چھوڑتا جاتا ہوں)

شام کو دھندلی روشنی میں اور کچھ دور سے میں نے اُسے دیکھا تھا لیکن اسوقت بجلی کی روشنی میں زیادہ قریب سے دیکھا، سچ کہتا ہوں مجھے اپنی بدبختی پر کس قدر افسوس ہوا کہ آج تک کیوں اس سے بیخبر رہا، میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ قدرت نے اسکو صرف میرے ہی لیے پیدا کیا ہے اور مجھ سے زیادہ اس بہار فطرت کی گل چینی کا مستحق اور کوئی نہیں ہوسکتا، آپ نے کل دور سے دیکھکر یہ حکم لگا دیا تھا کہ کمسن ہے، لیکن یقین کیجئے اس کے شباب کا وہ عالم ہے جیسے ایک لبریز جام شراب کہ ذراسی جنبش ہوئی اور چھلک پڑا، میں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور اس کے جسم سے برقی شعاعیں نکل نکلکر میرے خون کے اندر تپ کی سی حرارت پیدا کر رہی تھیں،

خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے لوگ خدا جانے کیا بے سروپا دلائل پیش کیا کرتے ہیں، حالانکہ اس سے زیادہ روشن دلیل اور کیا ہوسکتی ہے، کہ وہ ایک حسین عورت بھی پیدا کر سکتا ہے، اب خود غور کیجیے کہ افشردۂ ورود یاسمین کو منجمد کرکے اس سے ایک مجسمۂ جمیل تیار کرنا۔ اس کی رگ رگ میں شراب سیال دوڑا دینا اور کمر کی دونوں جانب کا بلور نکالکر سینہ میں بھر دینا تاکہ ایک ہی وقت میں شباب کی نزاکت و قوت دونوں بجلی کی منفی و مثبت رو کی طرح دیکھنے والے کو مسحور کریں۔ کیا سوائے خدا کے کوئی اور کر سکتا ہے، باور کیجیے یہ جی چاہتا تھا کاش میں ذرۂ خاک ہو کر اس کی راہ میں پڑ جاتا اور وہ پامال کرتی ہوئی گزر جاتی۔ الغرض کھیل شروع ہونے سے قبل جتنے مدارج محبت کے ہوسکتے تھے وہ سب فلم کی رفتار کی طرح جلد جلد طے ہوگئے۔ اور جسوقت روشن گل ہوئی تو سب کی نگاہیں پردہ پر تھیں، لیکن میں؟ ——— اب کیا کہوں، میری جگہ آپ ہوتے تو آپ بھی اسی گوہر شب چراغ کو دیکھا کرتے۔

تھوڑی دیر بعد جب اصل ڈراما شروع ہوا اور میں نے سر اُٹھایا تاکہ دیکھوں پردہ پر متحرک ہونے والی تصویروں میں کوئی صورت قابل التفات ہے یا نہیں تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی:۔

صبح کا وقت ہے اور خوش فضا صحرا، پہاڑوں کے نیچے صاف شفاف چشمہ جاری ہے

دونوں طرف کروندے کی سبز سبز جھاڑیاں ہوا کی وجہ سے آہستہ آہستہ جنبش میں ہیں

کنارے ایک جوگن بال کھولے ستار بجا رہی ہے ———"

مشکی زردہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

آپ مجھے یہ جوگن کون تھی ؟ بے اختیار منھ سے حیرت کی ایک ایسی آواز نکل گئی جس پر قریب کے دو چار آدمیوں نے مجھے مڑ کر دیکھا بھی، لیکن میں فوراً سنبھل گیا، اور غیر معمولی لطف و انہماک کے ساتھ تماشہ کی طرف متوجہ ہو گیا،

یہ ریل ختم ہوئی، درمیانی وقفہ آیا۔ اور جس وقت وہ باہر نکلی تو میں بھی ساتھ ساتھ آیا، اور ذرا آگے بڑھکر سامنے ہو گیا، اور نہایت عاجزی کے ساتھ سر جھکا کر میں نے اُس سے کہا۔

> اے محترم خاتون! معاف فرمائیے، میں بغیر کسی تعارف کے آپ سے خطاب کی جرأت کر رہا ہوں، لیکن رسمی تعارف کے انتظار میں میرا اپنے جذبات کو ضبط کرکے خون کر دینا غالباً اس آرٹ کی توہین ہوگی جس کا اظہار آپ نے آج کے ڈراما میں کیا ہے، میں نے امریکہ کے دوران قیام میں بڑی بڑی مثالیں تمثیل کی دیکھی ہیں کیونکہ کامل دو سال تک خود بھی وہاں کی رائل فلم کمپنی میں بحیثیت ایکٹر کے کام کر چکا ہوں لیکن یقین کیجیے کہ وہ بیساختہ پن جس کی نمایش آپ نے اپنی تمثیل میں کی ہے، وہ اس قدر عجیب و غریب چیز ہے کہ الفاظ اس کے اظہار سے قاصر ہیں

میں یقیناً اس سے جھوٹ بولا۔ کہ میں نے امریکہ میں سینما ایکٹر کی حیثیت سے کام کیا ہے، لیکن چونکہ میں اپنی ساری اسکیم مرتب کر چکا تھا، اس لیے اس کے مطابق مجھے یہ جھوٹ بولنا ضروری تھا اور آیندہ بھی خدا جانے مجھے کیا کیا اور کرنا پڑیگا۔

اس نے ایک منفعلانہ تبسم کے ساتھ جو صرف ایک ایکٹرس ہی کی طرف سے ظاہر ہو سکتا ہے، جواب دیا "آپ کے حسن ظن کا شکریہ، مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ آپ خود بھی سینما میں کام کر چکے ہیں" ———— وہ یہ کہکر گویا چاہتی تھی کہ راستہ صاف کر دیا جائے۔ لیکن میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا اور کہا "صرف یہی نہیں کہ میں سینما میں کسی وقت کام کر چکا ہوں بلکہ اب بھی اس غرض سے بمبئی آیا ہوں اور یہ میری انتہائی خوش نصیبی ہے کہ آپ سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی، جو ہندوستان کی تمام فضائے سینما کا درخشندہ ترین ستارہ ہے،

اس نے یہ سنکر تھوڑا سا تامل کیا اور بولی "اس وقت تک آپ کو مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی یا نہیں" ——— میں نے کہا "میں کل ہی آیا ہوں۔ اور ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کر سکا کہ کون کون سی کمپنیاں یہاں فلم تیار کرتی ہیں" اُس نے جواب دیا "کہ سب سے بڑی کمپنی تو میرے والد فریدوں جمشید جی کی ہے اور یہاں غالباً آپ کو کامیابی ہو جائیگی۔ اگر تکلیف نہو تو تماشہ کے بعد میرے ساتھ چلیے۔ اور گفتگو کر لیجیے"۔

خدا خدا کرکے کھیل ختم ہوا۔ اور میں رات ہی کو فریدوں جمشید جی سے ملا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے میری خدمات کو نہایت مسرت سے قبول کیا اور آج ہی صبح سے میں نے وہاں کام شروع کر دیا۔ چونکہ رات گفتگو میں زیادہ دیر ہو گئی تھی، اس لیے وہیں اورینٹل ہوٹل میں ٹھہر گیا"

جوں جوں وہ اپنی داستان بیان کرتا جاتا تھا، میری حیرت بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ ختم کر چکا تو پندرہ منٹ تک سکوت کا عالم

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر نہایت نفیس ہے

مجھ پر طاری رہا۔ اور پھر اس سے دریافت کیا کہ " یہ جو جھوٹ کا طومار باندھ کر تم نے وہاں ملازمت کر لی ہے۔ تو اسکا نتیجہ کیا ہوگا، ظاہر ہے کہ تم اس خدمت کو اچھی طرح انجام نہ دے سکو گے اور آخر کار نکالے جاؤ گے۔

—— یہ خیر یہ تو مستقبل بتائیگا کہ وہاں سے نکالا گیا، یا خود کسی کو نکال لایا۔ لیکن خدا کے لیے آپ تو لکھنؤ خط لکھ دیجیے تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے"

(۴)

اسلم کو فریدوں جی کی کمپنی میں ایک مہینے سے زیادہ کام کرتے ہو گیا ہے۔ اور اتنے عرصے میں اس نے اپنے آپ کو بہترین ایکٹر ثابت کر دیا ہے، سوائے اس کے کہ بوسہ لینے کی تمثیل میں وہ ضرورت سے زیادہ وقت صرف کر دیتا ہے۔ اور ۵ فٹ سے زیادہ فلم اس کے لیے درکار ہوتا ہے، فریدوں جی اسلم کی قابلیت اور ذہانت اور فن تمثیل کے ساتھ اس کی غیر معمولی مناسبت سے متاثر ہو کر بڑی حد تک اس سے بے تکلف ہو گیا ہے۔ اور چونکہ یہ تمام خدمات وہ بغیر کسی معاوضہ کے انجام دے رہا ہے۔ اس لیے مرعوب بھی ہے اور مکان پر اس کی بے تکلفانہ آمد و رفت کو گوارا کیے ہوئے ہے،

وہ متعدد ایسے ڈراموں کا ہیرو بن چکا تھا جن میں شیریں کو ہیروئن بننا پڑتا تھا۔ لیکن بدقسمتی یا اتفاق سے وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بنا پر شرکت سے باز رہی۔ اور اس لیے اسوقت تک کوئی ایسا موقع اُسے نہیں ملا کہ وہ تمثیل ہی کے پردہ میں اپنے جذبات کا اظہار کر سکتا۔

دوپہر کا وقت تھا، اسلم اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً فریدوں جی آیا اور بولا " آپ کو ایک خوشخبری سناتا ہوں۔ مہاراجہ کوبیر پور نے مجھے بلایا تھا وہ چاہتے ہیں کہ دیوالی سے پہلے فسانۂ عجائب کا فلم تیار کر دیا جائے۔ مصارف کا تخمینہ اُنھوں نے طلب کیا تھا۔ اُسے آج میں دے گیا تھا۔ اُنھوں نے منظور کیا اور ۵۰ ہزار پیشگی رقم بھی دیدی۔ میں نے قصداً بہت زیادہ مصارف درج کر دیے تھے تاکہ وہ ہمت ہار جائیں اور ہم اس ذمہ داری سے آزاد رہیں۔ کیونکہ وقت بہت کم ہے اور کام زیادہ۔ لیکن جب تخمینہ دیکھکر نصف رقم بھی ادا کر دی تو مجھے مجبوراً اقرارنامہ داخل کرنا پڑا یقین کیجیے میں نے صرف آپ کے اعتماد پر اس کام کو لیا ہے۔ اب آپ اس کو انجام تک پہونچایئے جانِ عالم آپ کو بننا پڑیگا اور ملکۂ مہر نگار شیریں کو۔ یہ تین ہزار کی حقیر رقم حق خدمت کے عوض میں پیش کرتا ہوں۔ اسے قبول کیجیے"

اسلم نے یہ سنکر فریدوں جی کے ہاتھ سے نوٹ لیکر پھر اُنھیں کی جیب میں رکھدیے اور بولا کہ " اس کی مطلق ضرورت نہیں ہے کیونکہ الحمد للہ اس سے زیادہ کی ماہانہ تنخواہ پانے والے خود میرے ہاں موجود ہیں میں آپ سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میرا سینما میں ایکٹر کی حیثیت سے کام کرنا صرف شوق کی بناء پر ہے۔ جسے میں محض اپنی دلچسپی و دلبستگی کی بناء پر اختیار کیے ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میرا شوق مجھے آپ کی اعانت کے لئے امادہ نہیں کر سکتا، تو روپیہ کی قوت مجھے کیا پابند کر سکتی ہے بہرحال آپ اطمینان رکھیے میرے امکان میں جو امداد ہے اس کے لیے میں ہر وقت حاضر ہوں۔ آپ تشریف لے چلیے میں ابھی حاضر ہوتا ہوں اور اسیوقت سے کام شروع کرتا ہوں۔

فریدوں کے چلے جانے کے بعد اسلم دیر تک سوچتا رہا اور پھر ایک فیصلہ کر کے جس کے آثار اسکے مسرور چہرہ سے عیاں تھے۔ اسٹیج کی طرف چلدیا۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر مل سکتا ہے

(۵)

ایک ہفتہ سے شب و روز فسانہ عجائب کا فلم تیار کرنے میں ہر شخص مصروف و منہمک ہے۔ اور تقریباً نصف حصہ مکمل ہو چکا ہے شام کا وقت ہے، اسلم اور شیریں دونوں ابھی ابھی فارغ ہو کر تفریح کے لیے ساحل قلابہ پر نکل آئے ہیں اور ایک بنچ پر خاموش بیٹھے ہیں۔ شیریں صندلی رنگ کی نوجوان لڑکی تھی۔ اور اسمیں شک نہیں کہ بمبئی کی پارسی جماعت میں جہاں حقیقتاً بہت کم کوئی مثال حسن کی نظر آتی ہے۔ غیر معمولی طور پر دلکش حسن و جمال کی مالک سمجھی جاتی تھی۔ یوں تو عمر کا اٹھارھواں سال ایک ایسا سحر کار و فسوں ساز سال ہے کہ ایک مرتبہ پوتھ کو بھی پارۂ الماس بنا کر چھوڑتا ہے۔ لیکن شیریں کا یہ موسم حقیقتاً ایسا نہ تھا کہ کوئی اُسے دیکھتا اور دیکھکر آسانی سے گذر جاتا۔ لب کا بادہ چکاں ہونا، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے ہر وقت نشہ سا ٹپکنا چہرے کا تکمیل کی حد تک زہرہ کے مجسمہ سے ماخوذ ہونا رخسار کا یکسر آتش بلوریں نظر آنا اور اسی طرح دیگر خصوصیات جمال ایسی ہیں جو اسلم کی نگاہوں سے اس سے قبل بھی گزر چکی تھیں۔ لیکن شیریں کا سا شباب اور تناسب اعضا اس کو کہیں نظر آیا نہ تھا۔

جسم کی انتہائی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ "وہ سانچہ میں ڈھلا ہو" لیکن شیریں کے قامت کو دیکھکر اسلم ایسا محسوس کرتا تھا کہ شاید سانچہ کا مفہوم ہی اس کو دیکھنے کے بعد سمجھ میں آسکتا ہے اور اس کا معیار یہی ہے کہ وہ شیریں کے قد و قامت پر ٹھیک اُترے رہا شباب سو اس کا یہ عالم تھا کہ اسلم اول تو اس کے خوف سے شیریں کو نگاہ بھر کر دیکھتا نہ تھا، اور اگر کبھی دیکھتا تو ایک لرزش سی اس کے جسم پر طاری ہو جاتی۔ اور اس کی ساری روح بیتاب ہو کر قوت لامسہ میں تبدیل ہو جانا چاہتی تھی۔

دونوں خاموش بیٹھے ہوئے سمندر کی لہروں اور ان کے ساتھ چاند کے کھیل کو دیکھ رہے تھے۔ کہ اسلم نے ہمت کر کے اس سکوت کو توڑا اور بولا "آپ کے ہاں پرستش آفتاب و آتش کو انسان کے کس جذبۂ پرستاری کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے"

—— "غالباً عظمت فطرت کا احساس"

—— "شاید، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا تعلق غالباً اعتراف جمال سے ہے، کیونکہ ہمارے ہاں بھی بہترین عبادت وہی ہے جسے پرستش حسن سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر کم از کم میرے مذہب میں عورت کو سجدہ کرنا قریب قریب فرض کے ہے۔

—— "میں نے مذہبی کتابوں کا مطالعہ تو نہیں کیا، لیکن یہ بالکل نئی بات ہے جو سن رہی ہوں، ابھی تو یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کا مرد بڑا ظالم و جابر چیز ہے اور عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مرد کا سجدہ کریں"

—— "آپ کو بالکل غلط اطلاع ملی ہے، اسلام تو اسقدر آزاد مذہب ہے اور اس نے عورت کا اتنا احترام روا رکھا ہے کہ شاید کسی مذہب میں ایسی نظیر نہ ملے۔ اور میں نے اس تعلیم سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر آج میں آپ کے ساتھ آفتاب کی پرستش کرنے پر آمادہ ہو جاؤں یا کسی مندر میں بُت کے سامنے سر جھکا لوں اور اس سے میرا مقصود صرف آپ کی یعنی کسی عورت کی دلداری ہو تو اس سے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

مستحسن امر کوئی نہیں ہو سکتا، یہانتک کہ اگر عورت کے لیے میں مذہب ایسی چیز کو بھی قربان کر دوں تو روا ہے "۔

——— اگر واقعی یہ ہے تو آزادی کی انتہا ہے، اور میں آپ کو مبارکباد دیتی ہوں کہ آپ ایسے آزاد مذہب کے مقلد ہیں جس کو شاید مذہب ہی نہیں کہہ سکتے "۔

——— " لیکن یہ آزادی اُسیوقت حاصل ہے جب کوئی عورت اسپر مجبور کرنیوالی ہو جس کا اسوقت تک مجھے کوئی موقع نہیں ملا "۔

——— " اور نہ شاید ملے کیونکہ آپ کی شادی تو بہرحال کسی مسلمان ہی لڑکی سے ہوگی اور وہ کیوں آپ کو ترک مذہب کرنے پر مجبور کرنے لگی "۔

——— " نہیں میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں شادی مذہب کے خیال سے بالکل علیحدہ ہو کر کرونگا خواہ اس کے لیے مجھے وہی غیر حقیقی زندگی کیوں نہ بسر کرنی پڑے۔ جیسی میں آجکل فسانہ عجائب کے فلم میں دیکھ رہا ہوں۔ کہ میں جانعالم ہوں اور آپ ملکہ مہر نگار حالانکہ آپ کے دل میں میرے لیے ادنی سا شائبہ اس محبت کا نہ ہوگا جس کا اظہار آپ اسٹیج پر کیا کرتی ہیں "۔

چونکہ شیریں اس فلم کی تیاری کے دوران میں کئی مرتبہ محسوس کر چکی تھی کہ اسلم اس سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے یہ وہ فقرہ سنکر چونکی اور چند سکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولی کہ " اگر میں واقعی آپ سے محبت کرتی تو شاید اس کی تمثیل مجھ سے ممکن نہ ہوتی "

——— " لیکن کبھی آپ نے اس امر کے امکان پر بھی اظہار حیرت نہیں کیا کہ آج ڈیڑھ مہینے سے میں آپ کی محبت کی آگ دل میں لیے ہوں پھنک رہا ہوں اور کسی کو خبر تک نہیں "۔

یہ کہکر اس نے شیریں کی طرف جھک کر اس کا دامن پکڑ لیا اور چاہا کہ اپنے جذبات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرے کہ شیریں اُٹھ کھڑی ہوئی اور دامن چھڑا کر بولی کہ " مسٹر اسلم، اب دیر زیادہ ہو گئی ہے، مجھے اجازت دیجیے "۔

اسلم بھی اس کے ساتھ اُٹھ بیٹھا، لیکن اس انداز سے جیسے کوئی جواری بڑی رقم لگانے کے بعد پانسہ پھینکے جانے کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہو۔ اور بولا:۔

" سنیئے، میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو ایک عزم کرنیکے بعد اس کو ہٹ جاتے ہیں۔ یا کسی بات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ اس حال میں کہ روح ہمنوا نہیں ہوتی۔ اس لیے آپ باور کیجیے کہ اگر آپ نے اس مرتبہ میری التجا کو ٹھکرا دیا تو میں اُسوقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک آپ کو یہ یقین نہ دلا دوں کہ آپ کا یہ انداز استغنا میرے لیے یقینی موت ہے "۔

یہ کہکر اس نے پھر شیریں کا دامن پکڑ لیا۔ اور بولا کہ " آپ جاتی ہیں تو جائیے لیکن جانے سے پہلے کم از کم یہ تو کہہ جائیے کہ آپ مجھ سے متنفر تو نہیں ہیں "۔

——— " میں آپ سے کیوں نفرت کرنے لگی، بلکہ ایک حد تک میں آپ کو پسند کرتی ہوں، اور آپ میں بعض ایسی خوبیاں پاتی ہوں جو عام طور پر بہت کم نظر آتی ہیں لیکن آپ کو یقین کرنا چاہیے کہ شادی کے مسئلہ میں بالکل مجبور رہوں۔ اور والدین کی مرضی کے

مشکی زردہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

خلاف میں کوئی وعدہ کسی سے نہیں کرسکتی"

—— "لیکن اگر وہ راضی ہو جائیں تو پھر اس وقت تو آپ کو کوئی عذر نہ ہوگا۔

—— "ہرگز نہیں"

(۶)

دیوالی کے تین دن باقی ہیں، اس لیے فلم کی تیاری نہایت تیزی سے جاری ہے، اور صرف اخیر کے دو منظر جو سارے ڈرامہ کی جان ہیں اور جن میں جانعالم اور مہر نگار کی شادی دکھائی جانے والی ہے۔ باقی رہ گئے ہیں۔

چونکہ یہ تیاری کا آخری دن ہے، اور شام تک فلم کو مکمل ہو جانا ہے، اس لیے بہت صبح اسٹیج پر تمام ضروری سامان مہیا ہے اور اسلم کا انتظار ہو رہا ہے۔

فریدوں جی نے کئی آدمی اسلم کے بلانے کے لیے بھیجے اور جب انھیں دیر ہوئی تو خود پہونچ گیا۔ لیکن وہ سخت حیران ہوا جب اس نے دیکھا کہ اسلم ابھی تک تیار نہیں ہے اور نہایت اطمینان سے بیٹھا ہوا کتاب دیکھ رہا ہے،

فریدوں جی نے کہا "مسٹر اسلم یہ کیا غضب ہے کہ آپ ابھی تک نہیں پہونچے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہے اگر آج فلم تیار نہ ہوا تو دیوالہ نکل جائیگا"

اسلم۔ جی ہاں۔ مجھے اس کا احساس ہے، لیکن افسوس ہے کہ میں اب بالکل مجبور ہوں اور آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا"

یہ سنکر فریدوں کی ایسی حالت ہو گئی جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو اور بولا۔ "مسٹر اسلم، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ خدا کے لیے رحم کیجیے، اور ایسا مذاق نہ کیجیے"

اسلم۔ "مذاق نہیں، میں واقعی عرض کر رہا ہوں۔ لیکن آپ اسقدر گھبراتے کیوں ہیں، بہت سے ایکٹر اور بھی موجود ہیں جو میری جگہ جان عالم بن کر مہر نگار سے شادی کرسکتے ہیں"

—— مگر یہ کیسے ممکن ہے جبکہ اسوقت تک سارے فلم میں آپ جانعالم کا پارٹ کر چکے ہیں۔ اول تو اس خوبی سے کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ اور اگر ممکن ہو تو بھی ہیرو کی صورت تبدیل ہو جانے کی تاویل کیا ہو سکے گی۔ اور اس نقص کے ساتھ میں کیونکر اُسے بھیج سکوں گا اور دیکھنے والے کیا کہیں گے یہ تو کسی طرح ممکن نہیں کہ دوسرا آپ کی جگہ کام کرے تاوقتیکہ شروع سے سارا فلم نہ بدلا جائے اور اس کے لیے وقت نہیں ہے ——"

—— "تو مجھ سے اب یہ نہیں ہو سکتا کہ جانعالم بن کر تو مہر نگار کے ساتھ شادی کروں لیکن اسلم ہونے کی حیثیت سے شیریں سے بالکل بیگانہ رہوں"

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ چاندنی چوک دہلی میں بھی ہے

فریدوں جی نے اسلم کا یہ فقرہ سننے کو تو سن لیا، لیکن اس نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے گرم سیسہ پگھلا کر دل و دماغ میں ڈالدیا ہے۔ اس کا ایک ایک ریشہ اینٹھا جارہا تھا اور سارے جسم پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا اور ایک ہی لمحہ میں ساری صورت حال اس کے سامنے آگئی ۔

ایک طرف تو اس کا سارا کاروبار تھا، اور دوسری طرف عزت کا خیال، اُسے یقین تھا کہ اگر اسلم راضی نہ ہوا تو اس کی کمپنی کا ٹوٹ جانا یقینی ہے، کیونکہ علاوہ اس ۵۰ ہزار کی رقم کے جسے وہ وصول کر چکا تھا۔ حسب معاہدہ اتنی ہی رقم اور ہرجانہ کی ادا کرنی پڑے گی، جسے وہ کسی طرح مہیا نہ کرسکتا تھا۔ لیکن اگر اس نے اسلم کے ساتھ شیریں کی شادی منظور کرلی تو سارے شہر میں ناک کٹ جائے گی، اور لوگ اُسے حقیر جاننے لگیں گے، اس لئے وہ کوشش کررہا تھا کہ کسی طرح ان مصیبتوں سے بچا رہے اور اس نے اپنی ہانت سے کام لیکر جو ایک پارسی تاجر کا حصہ ہے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور اسلم کو مخاطب کرکے اس نے کہا کہ اچھا مجھے منظور ہے۔ کل شادی بھی ہو جائے گی ۔

اسلم جو انسانی فطرت کا بڑا ماہر تھا، یہ سُنکر ہنسا اور بولا کہ "سیٹھ صاحب! میں بچہ نہیں ہوں جسے آپ وعدۂ فردا سے بہلالیں۔ شام کو فلم مکمل ہو جاتا ہے صبح کو میں آپ کا وعدہ یاد دلاتا ہوں اور آپ سنکر صرف ہنس دیتے ہیں، جناب من، میں نے آپ ہی کی کمپنی میں بیسیوں ایسے کھیل کھیلے ہیں۔ میں تو صرف اس شرط پر چل سکتا ہوں کہ پہلے شیریں میری ہو جائے۔ آپ جا کر اُنھیں لائیے۔ میں کپڑے پہن کر تیار ہوتا ہوں اور ایک گھنٹہ کے اندر سول میرج (civil marriage) کا قانون ہم دونوں کو واقعی جانعالم اور مہر نگار بنا دیگا۔ اور اس کے بعد ظاہر ہے کہ مجھے تعمیل ارشاد میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا ۔"

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

فلم تیار بھی ہوا، اور راجہ کو بیر کے علاوہ ہزاروں آدمیوں نے بھی دیکھا اور دیکھ رہے ہیں، لیکن اس حقیقت کا علم شاید اب بھی کسی کو نہیں کہ گو فسانۂ عجائب کے جانعالم اور مہر نگار کی ہستیاں فرضی رہی ہوں لیکن اس فلم میں اُن کا وجود بالکل حقیقی تھا۔ اور وہ اب بھی جب ایک دوسرے کو پکارتے ہیں تو انھیں ناموں سے !

نیاز فتحپوری

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سپلائی کرتے ہیں

نظامی عروضی اور چہار مقالہ

فارسی ادبیات میں بارھویں صدی عیسوی ایک ایسا مردم خیز دور ہے کہ اس کی نظیر کسی اور دور سے نہیں دیجاسکتی۔ سلاطین آل سلجوق اسلامی سرزمین کے ایک بڑے حصہ پر حکمران ہیں۔ غور و غزنہ کی ریاستیں منظر پر آتی اور جاتی ہیں۔ اس دور کی خاص خصوصیات یہ ہیں کہ ہر مضمون پر نہایت معتبر اور صحیح کتب لکھی گئیں۔ ایک طرف شاعری میں قصیدہ گوئی کو معراج کمال حاصل ہوئی تو دوسری طرف نثر میں تاریخ، مذہب، حکمت وغیرہ میں مبسوط اور مدلل کتابوں کا اضافہ ہوا۔ بادشاہوں کی خاص توجہ اور سرپرستی نے ادیبوں کے جذبات و خیالات کو بروئے کار لانے میں مسیحائی کی۔ قدر و منزلت کے ہاتھوں نے علم کے خزانوں کو لوگوں کے سینوں سے باہر نکالا اور علم و ادب میں ایک نئی روح پھونک دی۔

عام طور پر بلعمی وزیر امیر منصور بن نوح سامانی کے ترجمہ تاریخ طبری کو فارسی کی قدیم ترین کتاب نثر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد مختلف خاندانوں کی سرپرستی میں نثر کا تھوڑا بہت کام ہوتا رہا۔ حکیم ناصر خسرو کا سفرنامہ اور دیگر تصنیفات، نظام الملک کا سیاست نامہ، قابوس وشمگیر کے پوتے عنصر المعالی کا قابوس نامہ وغیرہ اس صدی کی مشہور تصنیفات ہیں۔ مغلوں کے متواتر حملوں اور خود ایرانیوں کی غفلت سے جہان اور بہت سی یادگار زمانہ چیزیں دنیا سے ناپید ہوگئیں ان میں اس دور کی اکثر علمی پیداوار بھی ہے۔ چنانچہ الفہرست اور دیگر تذکروں میں اس زمانے کی کتابوں کے نام پائے جاتے ہیں۔ مگر وہ تمام مفید اور اہم کتابیں مفقود ہیں جو کتابیں حسن اتفاق سے دست برد زمانہ سے بچ گئیں اُن میں ایک نظامی عروضی کا چہار مقالہ بھی ہے۔

چہار مقالہ کئی باتوں کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اول تو یہ قدیم کتب نثر میں سے ہے اور اس کی قدامت بہت کچھ اسکی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی حیثیت سے یہ کتاب بہت اہم ہے مصنف نے اپنے زمانہ کے چشم دید واقعات و حالات مختلف مباحث کے دوران میں بیان کیے ہیں۔ اس طرح معتبر تاریخی مواد اس غیر تاریخی کتاب سے حاصل ہو جاتا ہے۔ ایران کے مشہور شعرا کے حالات مصنف نے اپنے مشاہدہ سے لکھے ہیں۔ اور بہت سی مفید کار آمد باتیں جن سے اور تذکرے خالی ہیں، اس میں صحت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

چہار مقالہ کا مصنف نظامی عروضی ہے۔ اس کی تمام تر شہرت کا دار و مدار محض اسی کتاب پر ہے۔ شاعری کی بدولت اس کو مقبولیت اور شہرت کا کوئی حصہ حاصل نہیں ہوا۔ اس کی تاریخ ولادت و وفات کا تذکرہ میں بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ اسی طرح حالات زندگی سے اکثر تذکرے ساکت ہیں۔ اگر کچھ قابل امتیاز مواد کہیں سے دستیاب ہو سکتا ہے تو وہ اس کی کتاب ہی ہے جس سے محققین نے اسکے حالات زندگی اور تجر علمی کا

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگیئے

پتہ چلایا ہے۔

آغاز کتاب میں اس نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے "احمد بن عمر بن علی النظامی العروضی السمرقندی" بعض تذکروں میں اس کی کنیت ابوالحسن اور لقب نظام الدین یا نجم الدین پایا جاتا ہے۔ اسکا وطن جیسا کہ خود اس کے بیان سے ظاہر ہے سمرقند تھا۔ حُسن اتفاق سے اُس کے زمانے میں کئی ایک شاعر نظامی تخلص کرتے تھے چنانچہ اپنے مخدوم سے ایک موقع پر کہتا ہے۔

"درجہاں سہ نظامیم اے شاہ — کہ جہانے زمانہ افسانند"

لیکن ان تینوں کے علاوہ مشہور ترین نظامی گنجہ کے باشندے اور خمسہ یا سکندر نامہ، لیلیٰ مجنوں وغیرہ کے مصنف ہیں۔ رفع التباس کی خاطر نظامی مصنف چہار مقالہ نے اپنے تخلص کے بعد عروضی کے لفظ کا اضافہ کر لیا تھا۔ اس سے امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ علم عروض میں کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ نیز اس کی کتاب سے بھی اس کی عروض دانی پر کسی قدر روشنی ضرور پڑتی ہے۔

نظامی عروضی ملوک بامیان آل شنب کے دربار سے وابستہ تھا۔ آغاز کتاب میں اپنا نام لکھنے کے بعد کہتا ہے "چہل و پنج سال است تا بخدمت ایں خاندان موسوم است" اس نے اپنی تصنیف بھی اس خاندان کے ایک شہزادے ابوالحسن علی بن مسعود کے نام معنون کی ہے اس لحاظ سے آل شنب اور ان کے دونوں ذیلی خاندانوں کا تھوڑا سا بیان درج کیا جاتا ہے۔

ملوک غوریہ جنکو آل شنب بھی کہتے ہیں، سلطنت غور کے مالک تھے۔ اور انکا پایۂ تخت فیروز کوہ تھا، شنب ان کا جد اعلیٰ ہے جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کے دست مبارک پر بیعت کر کے مشرف باسلام ہوا تھا۔ اس خاندان کی حکومت ایک عرصہ تک غور اور اس کے آس پاس کے علاقہ پر قائم رہی۔ یہ خاندان ایرانی نسل نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق ترکوں سے ہے۔ آل شنب کا سب سے مشہور بادشاہ سلطان علاء الدین حسین ہے جو تاریخ میں جہاں سوز کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

غزنہ کے بادشاہ بہرام شاہ نے ایک غوری شاہزادے قطب الدین محمد کو جو اس کا داماد بھی تھا، سیاسی امور کی بنا پر دھوکے سے قتل کر ڈالا۔ قطب الدین کے بھائیوں (علاء الدین حسین اور سیف الدین سوری) نے بہرام شاہ پر چڑھائی کی اور اس کو سلطنت سے علیحدہ کر کے خود قابض ہو گئے۔ غزنہ کے باشندوں نے ان غوری شہزادوں کے خلاف سازش کی اور بہرام شاہ کو مدعو کیا۔ بہرام شاہ نے غزنہ کے باشندوں کی امداد سے سیف الدین سوری کو جو اسوقت غزنہ پر قابض و حکمران تھا، گرفتار کر لیا اور اُس کو اندھا کر کے سارے شہر میں اس کی تشہیر کی۔ سیف الدین سوری کا یہ حشر دیکھکر اس کا دوسرا بھائی علاء الدین حسین آگ بگولا ہو گیا۔ انتقام لینے کے لیے اپنی فوج جمع کی اور غزنہ کا رُخ کیا۔ مگر اس عرصہ میں بہرام شاہ قضائے الٰہی سے مر چکا تھا اور اس کا بیٹا خسرو شاہ اس کا جانشین ہوا تھا علاء الدین نے جذبۂ انتقام میں آکر غزنہ پر اس غضب کا حملہ کیا کہ نہ صرف وہاں لاکھوں روپے کی دولت لوٹ لی بلکہ سات دن تک شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اس کے مظالم اس درجہ شدید تھے کہ اُسی وقت سے وہ جہان سوز کہلانے لگا۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر بہت اچھا ہے

علاء الدین حسین عوزیون کا سب سے زیادہ زبردست بادشاہ گزرا ہے۔ اس نے سلطان کا لقب بھی اختیار کر لیا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ آل شنسب کے دو ذیلی خاندان تھے۔ ایک خاندان تو خاص غور پر حکمران تھا اور اُس کا پایہ تخت فیروز کوہ تھا۔ دوسرا غور کے شمال میں طخارستان پر حکومت کرتا تھا اور اس کا پایہ تخت بامیان تھا۔ اسی وجہ سے اس خاندان کو ملوک بامیان بھی کہتے ہیں نظامی عروضی کا تعلق براہ راست علاء الدین جہانسوز یا اُس کے صلبی جانشینوں سے نہیں تھا بلکہ وہ ملوک بامیان کا متوسل تھا جہانسوز کا ایک بھائی فخرالدین مسعود ابن عزالدین حسین ملوک بامیان کا پہلا بادشاہ ہے۔ اس کے دو بیٹے تھے، ایک ابوالحسن علی بن مسعود، جو نظامی کا مربی و مخدوم ہے اور دوسرا محمد بن مسعود۔ علی بن مسعود کا حال کسی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ صرف طبقات ناصری میں فخرالدین مسعود کی اولاد کے ذکر میں اس کا نام دیا ہوا ہے۔ اس کا سال وفات بھی معلوم نہ ہو سکا، چونکہ تالیف چہار مقالہ کے وقت بقید حیات تھا اس لیے اس کی وفات لازماً ۵۵۱ھ ہجری کے بعد واقع ہوئی ہوگی۔ نظامی عروضی اپنے اس مخدوم کا ذکر کرتے ہوئے اس کو ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے "پادشاہ وقت" یا "امروز افضل پادشاہان وقت است"۔ لیکن تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ ابوالحسن علی بن مسعود کبھی بادشاہ نہیں ہوا۔ ظاہر اس سے نظامی کی مراد شہزادہ کی ذات ہوگی

مقالہ دوم میں ایک موقع پر نظامی نے لکھا ہے "در ۵۱۰ھ ہجری پادشاہ اسلام سنجر بن ملک شاہ اطال اللہ بقاءہ وادام الی المعالی ارتقاءہ بحد طوس بہ دشت تردق بار داد و دو ماہ آنجا مقام کرد من از ہری بر سبیل انتجاع بدان حضرت پیوستم ...." اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سلطان سنجر سلجوقی کے دربار سے بھی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس سے اس پر مزید روشنی پڑتی ہو۔ البتہ سلطان علاء الدین حسین غوری اور سلطان سنجر سلجوقی کی ایک جنگ کا حال لکھا ہے جس میں نظامی کے مخدوم کا بھائی محمد بن مسعود بھی شریک تھا۔ جہانسوز کو سنجر کے مقابلہ میں شکست اُٹھانی پڑی اور وہ معہ اپنے ساتھیوں کے گرفتار ہو گیا۔

نظامی عروضی کے علم و فضل اور خاص فنون میں اس کی مہارت تامہ کا اندازہ اس کی کتاب کے اکثر بیانات سے ہوتا ہے۔ مقالہ اول میں دبیری پر بحث کرتے ہوئے ادب اور تاریخ وسیر وغیرہ کی ان مشہور و معروف کتب کے نام لکھے ہیں، جن کا جاننا نظامی کے نزدیک ایک دبیر کے لیے ضروری تھا۔ مقالہ سوم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندسہ، حساب، ہیئت اور احکام میں کافی دستگاہ رکھتا تھا چند اور حکایات سے اس کے منجم اور ہیئت دان ہونے کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ نجوم کے احکام، اس کے اسباب وغیرہ موقع بہ موقع تشریح و توضیح کی ہے۔ خود اس نے بھی نجوم کے حکم بعض موقعوں پر لگائے تھے اور ان میں سے وہ بیشتر صادق ہوئے۔ ملاحظہ ہو۔ چہار مقالہ مطبوعہ نولکشور پریس ص ۷۵، ۸۰، ۸۲۔ مقالہ چہارم میں جو "علم طب" و "ہدایت طبیب" پر ہے اس عہد کی مشہور و متداول کتب طب کے نام لکھے ہیں۔ اور اطبا کو ہدایت کی ہے کہ فلاں مرض کے لیے فلاں کتاب دیکھی جائے اور فلاں موقع پر فلاں کا مطالعہ کیا جائے۔ اجمالی طور پر

اعلیٰ عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

بعض امراض کی تفصیل بھی دی ہے۔ جیسے بخار کے اقسام حُمّی یوم وغب، منظر الغیب، ربع وغیرہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو حکیم بوعلی سینا کے ساتھ خاص عقیدت ہے۔ بوعلی کا نام ہر جگہ نہایت ادب و احترام سے لیتا ہے۔ ایک جگہ تو لکھتا ہے "اگر بقراط و جالینوس زندہ شوند روا بود کہ پیش ایں کتاب (قانون بوعلی سینا) سجدہ کنند" اس کا یہ اعتقاد بے وجہ نہیں تھا۔ علم طب میں بوعلی سینا کی ہستی غیر معمولی اہم ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اطبائے یونانی میں آج تک کوئی شخص اس کے پایہ کا نہیں گزرا۔

چہار مقالہ میں مصنف نے بعض جگہ اپنے حالات و واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰۴ھ میں اسکی سکونت اسکے وطن سمرقند میں تھی۔ یہاں رودکی کے متعلق ایک دہقان ابو رجا سے معلومات حاصل کی ۵۰۶ ہجری میں شہر بلخ کا سفر کیا اور حکیم عمر خیام سے ملاقات کی حکیم سے اسی مقام پر وہ مشہور پیشینگوئی سنی جو اس نے اپنے مزار کے متعلق کی تھی ملاحظہ ہو صفحہ ۸۰ ۵۰۹ ہجری میں ہرات گیا ۵۱۰ ہجری میں ہرات سے طوس کو روانہ ہوا۔ یہاں اُس زمانہ میں سلطان سنجر بن ملک شاہ سلجوقی کا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ نظامی نے سنجر کے ملک الشعرا امیر معزی سے ملاقات کی اور اپنے اشعار سُنائے معزی نے اشعار سنکر اس کی حوصلہ افزائی کی اور اپنے بعض حالات و واقعات اس کے سامنے بیان کئے اسی سنہ میں فردوسی طوسی کے مزار کی زیارت کر کے نیشاپور کا رُخ کیا۔ ۵۱۲ ہجری میں نیشاپور میں تھا اور ۵۱۴ ہجری وہیں امیر معزی سے سلطان محمود اور فردوسی کی حکایت سنی۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ چار پانچ سال اس نے نیشاپور ہی میں بسر کئے۔ ۵۳۰ ہجری میں دوبارہ نیشاپور گیا اور حکیم عمر خیام کی قبر کی زیارت سے مشرف ہوا اور اپنی آنکھوں سے ۵۰۶ ہجری کی پیشین گوئی کو صادق دیکھا۔ ۵۴۷ ہجری میں سنجر بن ملک شاہ سلجوقی اور سلطان علاء الدین غوری میں ہرات کے قریب صحرائے اوبہ میں جنگ ہوئی مصنف غوریوں کے لشکر کے ساتھ اس جنگ میں شریک تھا۔ غوریوں نے شکست کھائی اور غوری شہزادے گرفتار ہو گئے۔ اس زمانے میں نظامی اکثر ہرات ہی میں رہا اور اپنے مخدوم کے بھائی کی خبر گیری کرتا رہا جس کے صلہ میں بہت کچھ پایا۔ اپنے زمانے کے مشاہیر علما و فضلا سے نظامی عروضی کے عمدہ تعلقات تھے۔ خصوصاً حکیم عمر خیام کا بیحد معتقد تھا۔ جابجا حکیم عمر خیام کی علم نجوم میں غیر معمولی دستگاہ اور بلند پایہ ہونے کا ذکر کرتا ہے اور اسکو نجوم میں سند کے طور پر پیش کرتا ہے۔ شاعری میں نظامی عروضی کو کوئی خاص مرتبہ اور بلند پایہ حاصل نہیں بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ وہ امیر معزی ملک الشعرا دربار سلطان سنجر سلجوقی کا شاگرد تھا لیکن خود نظامی چہار مقالہ میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ لکھتا ہے کہ اس نے امیر معزی کو اپنے اشعار سنائے معزی نے حوصلہ افزائی کی اور ممکن ہے کہ بعض نکات بھی سمجھائے ہوں عموماً تذکرہ نویسوں نے ایک مثنوی ویسہ و رامین نظامی عروضی سے منسوب کی ہے اور بعض نے تو عجیب خلط مبحث کیا ہے کہ اسی نظم کو نظامی گنجوی اور فخری گرگانی کی طرف منسوب کیا ہے لیکن محقق مورخین اور تذکرہ نویسوں نے اتفاق رائے کیساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مثنوی دراصل فخر الدین اسعد گرگانی کی ہے نہ نظامی عروضی نے لکھی اور نہ نظامی گنجوی نے بعض تذکروں میں نظامی عروضی کے نام سے قطعے اور اشعار درج ہیں لیکن تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قطعوں کا مصنف رودکی ہے نہ کہ نظامی۔ البتہ بعض اشعار جو نظامی کے ہیں وہ لفظی صنعتوں اور ہزل و ہجا سے پُر ہیں اسکی شاعری وہبی اور "درجۂ اول" کی نہ تھی۔ اکتسابی طور پر اس نے چند اشعار لکھے جو "ادب عالیہ" کی ذیل میں داخل نہیں ہو سکتے۔ مذکورۂ بالا تمام حالات اسکی کتاب سے معلوم ہوتے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے اس کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے مزید معلومات حاصل ہوتی اس کا تذکرہ سب سے پہلے نور الدین محمد عوفی نے اپنی کتاب لباب الالباب میں کیا ہے اس کتاب کا سنہ تالیف ۶۱۸ ہجری ہے اور چہار مقالہ سے تقریباً ساٹھ سال بعد لکھی گئی ہے لیکن افسوس ہے کہ عوفی نے باوجود اس قربت کے کوئی معتبر اور صحیح بات

کارخانۂ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے جو چیز خلاف فرمائش پہونچے فوراً واپس کر کے اپنی پوری قیمت کے معاوضے میں دوسری چیز منگا لیجیے محصول ڈاک بھی معا

نظامی کے متعلق ایسی نہیں لکھی جسکی اُس سے توقع ہوسکتی ہے۔ عوفی کے بعد حمد اللہ مستوفی نے اپنی کتاب تاریخ گزیدہ میں جو سنہ ۷۳۰ ہجری میں تالیف ہوئی شعراء کے باب میں نظامی عروضی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:- "نظامی عروضی، معاصر نظامی گنجہ بود، کتاب مجمع النوادر از مصنفات اوست، اشعار خوب دارد، گویند سلطان از دیر رسید، نظامی غیر از تو کیست، گفت ع در جہان سہ نظامیم اے شاہ کہ جہانے ز ما بہ افغانند" اس کے بعد چار شعر اور دیے ہیں جو چہار مقالہ کے صفحہ ۴۶ پر درج ہیں۔ تیسرا تذکرہ جس میں نظامی کا ذکر ہے وہ دولت شاہ سمرقندی کا تذکرۃ الشعرا، ہے اس کا سنہ تالیف ۸۹۲ ہجری ہے اس میں جو باتیں بیان کی ہیں وہ غلط در غلط اور گمراہ کن ہیں اس کے بعد امین احمد رازی نے تذکرہ ہفت اقلیم میں سمرقند کے سلسلہ میں نظامی کا ذکر کیا ہے ہفت اقلیم سنہ ۱۰۰۲ ہجری کی تالیف ہے اسمیں محض الفاظ آرائی سے کام لیا گیا ہے اور بیجا ستائش و مشاہیر پرستی کی وجہ سے کوئی تازہ بات نہیں معلوم ہوتی بلکہ امین احمد رازی نے ایک اور غلطی یہ کی کہ چہار مقالہ کے علاوہ مجمع النوادر نام ایک اور کتاب نظامی عروضی سے منسوب کی جس سے بعض متاخر تذکرہ نویسوں نے بھی دھوکا کھایا۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض تذکروں میں اس کا نام ہے لیکن تجویزی معلومات ان سے حاصل نہیں ہوسکتی

چہار مقالہ

یہ نظامی عروضی کی وہ واحد معرکۃ الآرا کتاب ہے جس سے مصنف کا نام مشہور اور زندہ ہے۔ اس کتاب کا اصلی نام مجمع النوادر ہے چونکہ اس میں چار عنوانوں پر چار مقالے ہیں اس لیے یہ چہار مقالہ کے نام سے بھی مشہور ہوئی اور یہی نام بہت عام ہوگیا۔ تذکرہ نویسوں نے اس کے دو ناموں سے بہت کچھ دھوکا کھایا۔ امین احمد رازی مؤلف ہفت اقلیم نے خیال کیا کہ نظامی عروضی کی دو علیحدہ علیحدہ کتابوں کے نام مجمع النوادر اور چہار مقالہ ہیں۔ حاجی خلیفہ نے بھی احمد رازی کا تتبع کیا اور دو علیحدہ علیحدہ کتابیں قرار دیں، لیکن درحقیقت جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے یہ غلط ہے۔ سب سے پہلے حمد اللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ میں نظامی کا مصنفات میں صرف مجمع النوادر کا نام لیا ہے۔ اور چہار مقالہ کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ اس نے جو بیانات اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں وہ سب کے سب چہار مقالہ کے ہیں۔ ان میں سے ایک حکایت تورودکی و امیر نصر سامانی کی ہے جو چہار مقالہ مطبوعہ نولکشور پریس کی صفحہ ۳۹ سے شروع ہوتی ہے پس ظاہر ہے کہ اگر یہ دو نام علیحدہ علیحدہ کتابوں کے ہوتے تو پھر حمد اللہ مستوفی ضرور ان کا ذکر کرتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ قاضی احمد غفاری مؤلف نگارستان نے اپنی کتاب کے ماخذوں میں ایک بڑی فہرست دی ہے جس میں تاریخ، ادب، تذکرہ، وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ اس فہرست میں نظامی عروضی کا مجمع النوادر کا نام بھی ہے اور چہار مقالہ کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ نگارستان میں آٹھ سات حکایتیں مجمع النوادر نقل کی گئی ہیں وہ سب کا سب چہار مقالہ کی ہیں۔ ان میں سے ایک حکایت مصنف و عمر خیام کی ملاقات کی ہے جو چہار مقالہ کے صفحہ پر درج ہے مؤلف نگارستان اکثر ان حکایتوں کو نقل کر کے ان کے نیچے لکھتا ہے کہ "در مجمع النوادر آمدہ صاحب مجمع النوادر آوردہ" یا "در مجمع النوادر مسطور است" وغیرہ۔ اس امر سے بھی صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اصل میں یہ ایک ہی کتاب ہے جس کے دو نام ہیں۔ رضا قلی خاں مؤلف مجمع الفصحا اپنی کتاب میں اپنے ماخذوں کا ذکر کرتے ہوئے چہار مقالہ کے متعلق لکھتے ہیں "مجمع النوادر و نظامی عروضی مشہور

مشکی زردہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

بہ سمرقندی موسوم بہ چہار مقالہ" یہ صریح طور پر ثابت کرتا ہے کہ مجمع النوادر اور چہار مقالہ ایک کتاب کے دو نام ہیں۔

اس کی تاریخ تصنیف کا مصنف نے کہیں ذکر نہیں کیا ہے البتہ اس کا یقین نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے ص۵ پر سلطان سنجر بن ملک شاہ کے لیے اس طرح دعا کی ہے "اطال اللہ بقاءہ وادام الی المعالی ارتقائہ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان سنجر اسکی تصنیف کے وقت بقید حیات تھا۔ اور مورخین کا اتفاق ہے کہ سلطان مذکور نے ۵۵۲ھ ہجری میں وفات پائی۔ مقالہ اول میں مصنف نے دبیروں کے لیے جن کتب کا مطالعہ ضروری قرار دیا ہے ان میں ایک کتاب مقامات حمیدی بھی ہے۔ اور مقامات حمیدی کے اکثر نسخوں اور تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ تالیف ۵۵۱ھ ہجری ہے۔ لہذا نظامی عروضی نے چہار مقالہ ۵۵۱ھ ہجری و ۵۵۲ھ ہجری کے درمیان لکھا۔

فارسی کی قدیم کتب نثر کا اسلوب بیان ہمیشہ سے سادہ اور صاف رہا ہے۔ ہر ملک کے ادب میں سادگی اور صفائی متقدمین کے حصہ میں آتی ہے۔ متاخرین کچھ تو اس سیدھے سادے اسلوب سے بیزار ہو جاتے ہیں اور کچھ تازگی و نزاکت کے خیال سے مشکل پسند انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ سیاست نامہ نظام الملک طوسی اور سفرنامہ حکیم ناصر خسرو کی طرح اس کی عبارت بھی صاف اور سیدھی رہے۔ الفاظ اگرچہ عربی کے مشکل اور موٹے موٹے ہیں لیکن تشبیہ و استعارہ کی باریکیوں کی وجہ سے کتاب کا مضمون اخذ کرنا مشکل نہیں ہوا۔ جو بات مصنف نے بیان کی ہے اس کو بلا کسی تکلف اور آرائش کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں ادا کیا ہے۔ نیچرل اور سیدھا سادا اسلوب بیان کچھ ایسا دلفریب ہوتا ہے کہ مرور زمانہ کے بعد بھی کتاب میں حلاوت اور تازگی باقی رہتی ہے۔ جتنی بار کتاب پڑھو اتنا ہی زیادہ لطف حاصل ہوگا قبول عام اور بقائے دوام بھی اسی طرز کو حاصل ہے۔ مشکل پسند اور ادق طرز بیان کی کتابیں کاغذی پھولوں کے مانند ہیں جو تھوڑی دیر کے لئے اچھے معلوم ہوتے ہیں مگر اصلیت نام کو نہیں رکھتے۔ شیخ سعدی رح کی گلستان اسی سادگی کی بدولت قبول عام کا تمغہ حاصل کر چکی تھی۔ خدا جانے فارسی میں اس کے بعد کتنی پر تکلف اور ادق نثر کی کتابیں لکھی گئیں مگر کسی کو بھی ایسا عروج حاصل نہیں ہوا! یہی وجہ ہے کہ چہار مقالہ اپنی سادگی سے پھر لوگوں کو اپنا گرویدہ کر رہا ہے اور آج کل اس کی طرف توجہ نگاہیں اٹھ رہی ہیں مناسب ہے کہ بطور نمونہ ایک مختصر سی حکایت نقل کر دی جائے۔ اس سے اسکا اسلوب بیان اور صفائی ادا خود بخود پیش نظر ہو جائیگی۔ مقالہ سوم ص۸۳ کی حکایت ہے کہ "اگرچہ حکم حجۃ الحق عمر بدیدم، اما ندیدم اورا در احکام نجوم، ہیچ اعتقادی، واز بزرگاں ہیچ کس ندیدم، وشنیدم کہ در احکام نجوم اعتقادی داشت، در زمستان سنہ ثمان وخمسمائۃ بشہر مرو سلطان کسی فرستاد بہ خواجہ بزرگ صدر الدین محمد بن المظفر رحمۃ، کہ خواجہ امام عمر را بگوی تا اختیارے کند، کہ بشکار رویم کہ اندر آن چند روز برف وباران نیاید، وخواجہ امام عمر در صحبت خواجہ بود، ودر سرای او فرود آمدی، خواجہ کس فرستاد، واورا بخواند، ماجرای باوے بگفت، برفت ودو روز در آن کرد، واختیاری نیکو کرد، وخود برفت، وباختیار سلطان را برنشاند، وچوں سلطان برنشست، ویک بانگ زمیں برفت، ابر در کشید وباد برخاست وبرف ودمہ در ایستاد، خندھا کردند۔ سلطان خواست کہ باز گردد،

اگر آپ کو عمدہ عطر کی ضرورت ہو تو اصغر محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کے کارخانہ منگائیے

خواجہ امام گفت، پادشاہ دل فارغ دارد کہ ہمیں ساعت ابر باز شود، و دریں پنج روز ہیچ نم نباشد، سلطان براند، و ابر باز شد، و ندآں پنج روز ہیچ نم نبود و کس ابر ندید، احکام نجوم اگرچہ صنعتے معروف است اعتماد را نشاید، و باید کہ منجم در آں اعتماد دورے نہ کند، و ہر حکم کہ کند حوالہ باتفاق کند۔"

فارسی زبان میں باوجود مدت مدید گزر جانے کے کوئی بڑا انقلاب نہیں ہوا، صرف بعض الفاظ متروک ہوگئے، بعض تبدیلیاں جملوں کی ترکیب میں واقع ہوئیں اور حرف عطف "و" اور "کہ" وغیرہ کی کمی وزیادتی ہوتی رہی۔ آج سے ہزار برس پہلے کی نثر بھی بغیر کسی دقت کے اس وقت پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہی حال چہار مقالہ کا ہے۔ اس کی زبان میں بالکل معمولی اور وہ بھی بہت تھوڑی تبدیلی ہوئی ہے۔ اور اکثر حصے تو بالکل صاف اور قریب الفہم ہیں اس زمانے کے لوگ اس کو بلا کسی زحمت کے پڑھتے اور سمجھ سکتے ہیں۔

چہار مقالہ کا موضوع بڑا دلچسپ اور پُر لطف ہے۔ جیسا کہ اُس کے عرف عام سے ظاہر ہوتا ہے یہ چار مقالوں کا مجموعہ ہے اور اسی لحاظ سے کہ اس میں کمیاب بعض نایاب باتیں جمع کی ہوئی ہیں اسکا دوسرا نام مجمع النوادر بھی بہت کچھ مناسب حال ہے۔ مصنف کے خیال میں بادشاہ کے لیے چار شخصوں کی خاص طور پر ضرورت ہے اور وہ دبیر، شاعر، منجم، اور طبیب ہے، وہ لکھتا ہے کہ "قوام ملک بہ دبیر است و بقائے اسم جاودانی بشاعر، نظام امور بہ منجم، صحت بدن بہ طبیب"، "پادشاہ خردمند را چارہ نیست ازیں چار شخص، دبیر، و شاعر، و منجم، و طبیب"، ہر مقالہ میں پہلے اس کے متعلق چند باتیں بطور تمہید حکمت کی بیان کی ہیں اور اس کے بعد مضمون مقالہ کے متعلق دس دس حکایات لکھی ہیں۔ مقالہ چہارم میں بجائے دس کے عام نسخوں میں گیارہ حکایات ہیں اور اسلامیوں کے ایک قلمی نسخے میں بارہ حکایات ہیں۔ مذکورۂ بالا چاروں پیشوں کے متعلق اپنے زمانے کی بہترین معلومات یکجا کی ہے۔ مقالہ اول میں "ماہیت دبیری وکیفیت دبیر کامل وانچہ بدیں دارد" نہایت عمدگی کے ساتھ بحث کی ہے۔ دبیروں کے قابل مطالعہ کتب کا ذکر کیا ہے اور مثالوں اور حکایتوں سے اپنے بیانات کی تائید کا کام لیا ہے۔ اسی طرح شاعری، نجوم اور طب کے متعلق غیر معمولی دلچسپ اور پسندیدہ حکایتیں اور بیانات پیش کیے ہیں نظامی عروضی نے اپنے عہد کی تمام مصنفات کا مطالعہ کر کے ان میں سے بہترین معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور فن کی مستند و معتبر کتاب کے مطالعہ کی سفارش کی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، یہ کتاب غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اول تو فارسی کی ان قدیم مصنفات میں سے ہے جو آجکل ناپید ہوتی جاری ہیں اُس زمانہ کی لکھی ہوئی کتابیں بہت کم باقی ہیں اور اس لحاظ سے قدیم فارسی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس میں تاریخ و تذکرہ کی بہت سی باتیں صحت کے ساتھ دی ہوئی ہیں اور یہ بہت کم کتب تاریخ و تذکرہ میں دستیاب ہوتی ہیں۔ اسکا مقالہ دوم تاریخ ادب کے لحاظ سے بہت زیادہ اہم ہے، اس میں ملوک سامانیہ، غزنویہ، خانیہ، دیالمہ، سلجوقیہ، وغوریہ کے ہمعصر شعرا کا ذکر کیا گیا ہے بخصوصاً رودکی، عنصری، فرخی، معزی، فردوسی، ازرقی، رشیدی اور مسعود سعد سلمان کے متعلق بہت ہی دلچسپ اور اہم باتیں بیان کی ہیں۔ نظامی عروضی

اعلیٰ عطر کارخانہ اصغر علی محمد تاجر عطر لکھنؤ سے مل سکتا ہے

چونکہ عمر خیام کا معاصر تھا اور اس سے ملاقات تھی، اس کا بیان زیادہ صحیح ہے۔ حکیم عمر خیام نے اپنی قبر کے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی اُس کا ذکر صرف نظامی نے کیا ہے۔ اسی بنا پر مسٹر جرالڈ رباعیات عمر خیام کے انگریزی مترجم کی قبر پر ایران سے گلاب کا پودا لاکر لگایا۔ تذکرہ اور تاریخ کی اکثر کتابوں نے اپنی معلومات چہار مقالہ سے حاصل کی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ابن اسفندیار نے چہار مقالہ سے سلطان محمود اور فردوسی کی حکایت نقل کی ہے، تاریخ گزیدہ، تذکرہ دولت شاہ، نگارستان، قاضی احمد غفاری وغیرہ نے بہت سے حالات اس سے اخذ کیے ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ اس کا اسلوب اس درجہ سادہ اور دلکش ہے کہ نثر نویسی کا بہترین نمونہ ہوسکتی ہے۔ متاخرین کی مصنفات میں یہ خوبی نہیں۔ بعض قدیم کتب جیسے تاریخ ابوالفضل بیہقی، تذکرۃ الاولیا، فریدالدین عطار، گلستاں شیخ سعدی، اور تاریخ برگزیدہ حمداللہ مستوفی کا طرز بھی ایسا ہی سادہ اور دلکش ہے۔

اگر چہار مقالہ کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نظامی عروضی نے باوجود اپنے تبحر علمی و وسعت معلومات کے اس مختصر سی کتاب میں کئی ایک تاریخی غلطیاں کی ہیں۔ بعض موقعوں پر لوگوں کے اسمار خلط ملط کردیے اور بعض جگہ تاریخیں غلط لکھیں اور کہیں بے جوڑ واقعہ بیان کردیا۔ ذیل میں اس کی چند موٹی موٹی غلطیاں بتائی جاتی ہیں۔ ان غلطیوں سے اس کی کتاب کی جو خاص اہمیت ہے اس میں کچھ فرق نہیں ہوتا کیونکہ ایران کے مصنف اور مورخ تاریخوں کی صحت اور تحقیق کی طرف بہت کم مائل تھے، نظامی کی کتاب باوجود ایسے زمانے کی تصانیف ہونے کے بہت بڑی حد تک معلومات کا ذخیرہ ہے۔

(۱) اسکافی کو نوح بن منصور بن نوح بن نصر بن احمد سامانی کا دبیر بیان کیا ہے حالانکہ وہ نوح بن منصور کے دادا نوح بن نصر کا دبیر تھا اور نوح بن منصور کی تخت نشینی سے بیس سال قبل وفات پاچکا تھا۔ ظاہرا یہ غلطی دونوں بادشاہوں کے نام ایک ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے، ملاحظہ ہو ص۲۔

(۲) اسی حکایت میں سلطنت غزنویہ کے بانی البتگین کو نوح بن منصور کا معاصر بتایا ہے۔ نوح بن منصور ۳۶۶ھ ہجری میں تخت نشین ہوا اور البتگین بہ اختلاف آرار ۳۵۱ھ ہجری یا ۳۵۲ھ ہجری میں فوت ہوا۔

(۳) اسی حکایت میں ایک اور غلطی یہ کی ہے کہ سبکتگین کے متعلق بیان کیا ہے کہ اس نے سیجوریوں کے ساتھ مل کر البتگین کے خلاف خراسان میں جنگ کی۔ حقیقتاً البتگین اس جنگ کے کئی سال قبل مرچکا تھا اور سبکتگین نے یہ جنگ سیجوریوں کے خلاف کی تھی نہ کہ ان کے ساتھ سے کسی اور کے خلاف یہ تاریخ سلطنت غزنویہ کا مسلمہ اور مشہور واقعہ ہے۔

(۴) اسی حکایت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ سامانیوں کے عہد کا ایک سردار ابوعلی احمد بن محتاج چغانی، نوح بن منصور کا معاصر تھا، اور یہ بھی لکھا ہے کہ سبکتگین کی لشکر کشی کے وقت بقید حیات تھا، اس کے ساتھ ہی اس کے نام، وطن اور عہدہ کے بیان میں بھی غلطی کی ہے ابوعلی احمد بن محتاج نہ تو نوح بن منصور کا معاصر تھا اور سبکتگین کی لشکر کشی کے وقت بقید حیات تھا۔

مشکی زردہ اصغر علی محمد علی سے بہتر دوسری جگہ نہیں ملتا

یہ تمام غلطیاں جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے نوح بن منصور اور نوح بن نصر کے ناموں کے التباس کی وجہ سے معلوم ہوتی ہیں

(۵) اسی طرح ماکان بن کاکی کو بھی نوح بن منصور کا ہمعصر لکھا ہے۔ حالانکہ وہ اس کے پردادا نصر بن احمد سامان کے عہد میں تھا اور نوح بن منصور کے سنہ جلوس سے اڑتالیس سال قبل فوت ہو چکا تھا۔

(۶) ماکان بن کاکی کے ساتھ جس سردار نے جنگ کی تھی اُس کا نام تاش سپہ سالار لکھا ہے۔ مگر مورخین کا اتفاق ہے کہ ابو علی احمد محتاج نے ماکان کے خلاف جنگ کی اور اُس کو قتل کر ڈالا۔ ص۲۴

معلوم ہوتا ہے کہ سامانیوں کے متعلق انکی معلومات بالکل ناقص اور غیر مکمل تھی ان دو حکایتوں میں مذکورہ بالا غلطیوں کے علاوہ اور بہت سی فروگذاشتیں اور تاریخی سقم ہیں۔

(۷) حسن بن سہل کو اسکے بھائی فضل بن سہل کے ساتھ مشتبہ کر کے ذوالریاستین کے لقب کو اس سے منسوب کیا ہے اور خلیفہ مامون کی بیوی بوران کو بھی اس کی بیٹی بتایا ہے۔ حالانکہ ذوالریاستین فضل بن سہل کا لقب تھا اور بوران بھی فضل کی بیٹی تھی ص۲۶

(۸) سلطان مسعود سلجوقی کو سلطان سنجر سلجوقی کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور خلیفہ المسترشد باللہ کے متعلق لکھا کہ اس نے سلطان سنجر کے خلاف لشکر کشی کی تھی۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ خلیفہ کی یہ لشکر کشی سلطان مسعود سلجوقی کے خلاف ہوئی تھی۔

(۹) ملوک خانیہ ماوراء النہر کے ایک سردار ایلک خان کو بغرا خان لکھا ہے اور بغرا خان کو سلطان محمود غزنوی کا ہمعصر بتایا ہے حالانکہ محمود غزنوی کا ہمعصر ایلک خاں تھا۔

(۱۰) صفحہ ۵۶ پر مسعود سعد سلمان کے سلسلہ میں بھی دو تین تاریخی غلطیاں کی ہیں۔ لیکن یہ کچھ زیادہ اہم نہیں۔

(۱۱) اسی طرح ایک مجہول شخص شہاب الدین قتلمش اسب غازی ذکر میں صرف دو سطروں میں پانچ چھ غلطیاں کی ہیں۔

(۱۲) یعقوب بن اسحٰق کندی جو عرب کا مشہور فلسفی ہے، یہودی لکھا ہے۔ حالانکہ اس آبا و اجداد مشہور اسلامی اور عربی خاندان سے ہیں اور خلفائے بنی امیہ و بنی عباس میں عامل و عہدہ دار رہ چکے ہیں۔ اس کے جد اعلیٰ حضرت اشعث رضی اللہ عنہ بن قیس رضی اللہ عنہ حضور صلعم کے صحابہ میں سے تھے۔ یعقوب کے متعلق جو حکایت لکھی ہے وہ سرتاپا لغو اور غلط ہے۔ ص۷۰ تا ص۷۲

(۱۳) مشہور طبیب محمد بن ذکریا رازی کو منصور بن نوح سامانی کا معاصر لکھا ہے۔ حالانکہ انھوں نے منصور کی تخت نشینی سے تیس سال قبل وفات پائی تھی۔ اور ان کے متعلق جو حکایت لکھی ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے۔

(۱۴) علاء الدین بن کاکویہ کو شمس الدولہ بن فخر الدولہ دیلمی کے ساتھ خلط ملط کر کے شیخ ابو علی سینا کو علاء الدین کا وزیر بتایا ہے شیخ ابو علی سینا شمس الدولہ دیلمی کے وزیر تھے اور ان کی وزارت ہمدان میں تھی نہ کہ مرسے بین جیسا کہ نظامی نے لکھا ہے۔

(۱۵) سلطان محمود غزنوی اور فردوسی کی حکایت بھی بے بنیاد اور غلط درج کر دی ہے اور یہ سلسلہ بہ سلسلہ تذکروں میں غلط در غلط چلی آئی

چہار مقالہ کے تین قلمی نسخوں کا پتہ چلا ہے - ایک نسخہ جو قدیم کہا جا سکتا ہے، قسطنطنیہ میں ہے - اور یہ سنہ ۸۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے اس نسخہ اور دیگر نسخوں میں بہت زیادہ اختلاف ہے - اس کے علاوہ برٹش میوزیم میں "دو نسخے محفوظ ہیں، ان میں سے ایک جو اور نسخوں کے مقابلے میں بہت زیادہ صحیح ہے سنہ ۱۰۱۷ ہجری کا لکھا ہوا ہے - اور دوسرا سنہ ۱۲۷۴ ہجری کا لکھا ہوا ہے - یہ آخر نسخہ صحت و سقم کے لحاظ سے ساوی ہے - ان قلمی نسخوں کے علاوہ مطبوعہ نسخوں قدیم ترین نسخہ طہران کا معلوم ہوتا ہے - اسکا سنہ طباعت ۱۳۰۵ھ ہے - اس میں بیحد غلطیاں اور تحریفات ہیں - سنہ ۱۹۱۰ء میں "سلسلہ اوقاف خیریہ گب" میں ایک نہایت عمدہ نسخہ شائع ہوا ہے

مرزا محمد ابن عبدالوہاب قزوینی نے مذکورۂ بالا نسخوں اور دیگر کتب کا مطالعہ کر کے نہایت محنت سے مرتب کیا ہے اس کی طباعت نہایت اہتمام سے ہوئی ہے - شروع میں مرتب کنندہ نے مقدمہ لکھا ہے جس میں اس کتاب اور اس کے مصنف کا مختصر سا حال دیا ہے متن کتاب میں صحیح ترین قرأت کو اختیار کیا گیا ہے اور غیر معمولی کاوش و تحقیق سے دو سو صفحوں پر مشتمل حواشی لکھے ہیں جن میں اصل کتاب کے مختلف بیانات اور اسما کی توضیح و تشریح کی ہے - اور مؤلف کی غلطیاں بھی دکھائی ہیں چنانچہ مذکورۂ بالا فرد گزاشتوں اور غلطیوں کا اکثر و بیشتر حصہ اور مصنف کے بعض حالات زندگی انھیں کی ان تھک محنت اور جستجو کا نتیجہ ہے - اس کے علاوہ فہرست اسماء الرجال، فہرست کتب اور مختلف نسخوں کے مقابلے سے اختلاف قرأت کو نہایت صحت سے بیان کیا ہے - مرزا محمد نے جن غلطیوں کی تحقیق کی ہے ان کی طرف کسی تذکرہ نویس نے بھی توجہ نہیں کی بلکہ غلط در غلط بیانات بجنسہ چہار مقالہ سے نقل کر لیے اور اسطرح اصل واقعات پر بھاری پردہ پڑا رہا - سنہ ۱۹۲۲ء میں نولکشور پریس سے ایک نسخہ شائع ہوا - بظاہر یہ نسخہ طہران کے مطبوعہ نسخے سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اس کے علاوہ سنہ ۱۹۲۵ء میں ایک اور نسخہ شیخ مبارک علی لاہور نے عندلیب شاداں کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے - عندلیب شاداں نے مرزا محمد قزوینی کے مقدمے کو اردو کر دیا ہے اور کتاب بھی گب میموریل سیریز کے نسخے سے نقل کی گئی ہے اس لیے بہت کم غلطیاں ہیں -

سنہ ۱۸۹۹ء میں پروفیسر براؤن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو اسی سال شائع بھی ہوا -

سنہ ۱۹۲۱ء میں ترجمہ کی نظر ثانی کر کے گب میموریل سیریز میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا -

یورپ اور انگلستان کی ہر ایک مستشرق نے چہار مقالہ سے استفادہ کیا ہے اور ہر ایک اس کی بے حد تعریف و توصیف کرتا ہے چنانچہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر ادبیات ایران اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ چہار مقالہ ایسی زبردست کتاب ہے جس کا سلجوقیہ دور کو فخر حاصل ہے - فقط

سید محمد حیدر آبادی

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر بہت اچھا ہے

درسِ مُحبّت

(فسانہ)

معبد زہرہ کی کنواریاں سب کی سب پاکباز رہی ہوں یا عصمت فروش - اس سے بحث نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ دُر دانہ زہرہ کی پرستش اس کو عصمت کی دیوی ہی سمجھکر کرتی تھی اور جس وقت وہ معبد سے تجدید تقدس کے بعد باہر نکلتی تو لوگ ایسا محسوس کرتے کہ شاید دنیا میں تخلیق کی ابتدا ابھی ہوئی ہے اور قلب انسانی ان ضربات سے ہنوز ناآشنا ہے جو خون میں ناجائز حرارت پیدا کرکے ــــــــ روح کو آہستہ آہستہ داغدار کرتے رہتے ہیں -

یونان کے مذہبی دور حسن پرستی کا یہ وہ زمانہ انحطاط تھا جب یونان کا ایک ایک نوجوان قلب الگ الگ ایک مخصوص زہرہ کا معبد بنا ہوا تھا - اور مذہب ان کے ہاں نام تھا محض اس زندگی کا جس کی ترکیب صرف عورت، شباب حسن اور عشق کے عناصر اربعہ سے ہوئی تھی -

خانقاہِ زہرہ کا ایک ایک حجرہ، باغ معبد کا ایک ایک کنج جہاں کسی وقت صرف حسن فطرت کی پرستش ہوا کرتی تھی جو کسی زمانہ میں مخصوص تھا - صرف جمیل مناظر قدرت کے مطالعہ کے لئے ایک خلوت کدہ تھا - جہاں عصمت "آشفتہ بخوں" اور محبت "آوارہ جنوں" نظر آتی تھی

ملک کا کوئی نوجوان ایسا نہ تھا جس نے اپنی عمر کے سیکڑوں دن اس سعی میں بسر نہ کر دئے ہوں کہ اس فضا کی کم از کم ایک ہی معطر رات اسے میسر آجائے اور مشکل سے کوئی آشفتہ شباب ایسا ملیگا جس نے ایک مرتبہ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد دنیا میں پھر کسی اور لذت کی خواہش کی ہو -

دُر دانہ ایک امیر خاندان کی لڑکی تھی جس کو اس کے والدین نے ایک خواب کی ہدایت کے مطابق خانقاہِ زہرہ کیلئے وقف کر دیا تھا اور جس کی کمسنی یہیں کی سم آلود فضا میں ریعانِ شباب تک پہنچی تھی - اس میں شک نہیں کہ یوں تو خانقاہ کی ہر کنواری اپنی اپنی جگہ ایک بے پناہ مجسمۂ حسن و شباب تھی لیکن دُر دانہ اُس کا تو یہ عالم تھا جیسے فطرت کے کسی حسین خواب نے انسانی صورت اختیار کر لی ہو -

لوگ کہتے تھے کہ دُر دانہ سے زیادہ حسین ہونا گویا خدا ہو جانا ہے، اور شاید یہی وہ جذبہ تھا جس نے ابھی تک کسی کے دل میں اس کے پاس "التجائے غیر معصوم" لیجانے کی ہمت پیدا نہ ہونے دی تھی - لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ گذشتہ دو سال کے اندر جب سے اس نے نمودِ شباب کے بعد، حسب دستور نقاب پوش ہو کر نکلنا شروع کیا تھا لوگوں کی تمناؤں میں کس قدر تلاطم برپا کر دیا تھا - اور ان کا تخیل اس کے نقاب پوش حسن کو کس کس انداز سے عریاں دیکھا کرتا تھا -

کیا آپ نے ابھی تک صغیر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر نہیں منگایا

"یوں تو ملک کا ہر وہ شخص جس کی رگوں میں جوان خون دوڑ رہا تھا، دُر دانہ کے لئے یکسر اضطرابِ شوق بنا ہوا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ نمایاں اور اپنے آپ کو مستحقِ کامیابی سمجھنے والی بیتابی شاہزادہ نیرو بی کی تھی جو نہ صرف اپنے حسنِ صورت بلکہ اکتسابات ذہنی کے لحاظ سے بھی اس وقت یونان کا ایک ہی نوجوان تھا۔

چاندنی رات تھی، خانقاہ کے نیچے بہنے والی ندی میں چاند نے چراغاں کر رکھا تھا اور وادی پر سکونِ مطلق طاری تھا کہ دفعتاً اس سکون میں تبدیلی پیدا ہوئی اور ساحل کے ایک جانب سے بربط کے تاروں کی نازک لرزش آ آ کر ہوا میں ملنے لگی رفتہ رفتہ اس لرزش کا تواتر بڑھا، جھنکار میں زور پیدا ہونے لگا اور نسائی آواز موسیقی بن بن کر تاروں پر دوڑنے لگی۔ دُر دانہ کا معمول تھا کہ کبھی کبھی وہ رات کو تنہا نکلکر ساحل پر آجاتی اور دیر تک بیٹھی ہوئی بربط کے ساتھ گایا کرتی۔ اس کا گانا حقیقتاً ایک قسم کی عبادت تھا، اس کی موسیقی گویا اس کی پرستش کی زبان تھی جس کے سمجھنے والے اور جس سے صحیح اثر لینے والے اُسے کہیں نظر نہ آتے تھے اور اس لئے وہ جنگل ہی کی بیجان چیزوں کے سامنے اپنا فلسفہ بیان کیا کرتی، اور یہیں کبھی ہنستی ہوئی اور کبھی آنسو خشک کرتی ہوئی واپس جاتی۔

سفید چادر، چاندنی رات، اور دُر دانہ کا بے نقاب حسن صبیح حقیقت ہے کہ اس نقرئی لوح پر یہ نقشِ سیمیں مشکل سے ابھر سکتا، اگر اس کے بالوں کی گہری سیاہی اس یکسانیت کو دور کرنے والی نہ ہوتی وہ ایک چٹان پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھی تھی اور بربط پر اپنی لانبی نازک انگلیوں سے اپنی داستانِ پرستش کہہ رہی تھی۔

جب رات زیادہ ہو چکی اور چاند بلند ہو کر دُر دانہ کے سر سے گذرنے لگا تو اُس نے اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن وہ کھڑی ہونا چاہتی تھی کہ سامنے کے کنج سے ایک انسان سفید چادر میں ملفوف آگے بڑھتا ہوا نظر آیا پہلے تو وہ کچھ ڈری۔ لیکن چونکہ ایک پاکباز دل دنیا میں کسی چیز کی طرف سے عرصہ تک خائف نہیں رہ سکتا، اس لئے وہ پھر اطمینان سے وہیں بیٹھ گئی اور جبوقت آنے والے نے اس کے استفسار کے جواب میں اپنا نام نیرو بی بتایا تو دُر دانہ تعظیماً کھڑی ہوگئی۔ اور بولی کہ شہزادہ کو کس چیز نے ایسے ناوقت اس قدر زحمت برداشت کرنے پر مجبور کیا"

نیرو بی بولا "کیا وہ خاتون جس کو دنیا میں سب سے زیادہ حسین ہونے کا امتیاز حاصل ہے اس بات کو نہیں سمجھ سکتی، کہ نیرو بی جس کی زندگی میں اب کوئی وقت، وقت کہلائے جانے کے قابل نہیں رہا۔ مگر وہ جو کسی حقیقی حسن کے سامنے بسر ہو، کیوں ایسے ناوقت اس قدر زحمت برداشت کرنے پر مجبور ہو گیا"

دُر دانہ یہ سن کر صرف ہنس دی نیرو بی سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا "کیا جس نے تیرا منھ ان پاکیزہ موتیوں سے بھرا ہے وہ تجھے اس امر پر مجبور نہیں کر سکتا کہ تو میری قسمت کا آخری فیصلہ سنا دے"

دُر دانہ بولی "آہا۔ شاہزادہ نیرو بی تو بہت اچھا شاعر ہے" اور یہ کہکر پھر ہنس دی شاہزادہ نیرو بی بولا "اُف! دُر دانہ گھڑی گھڑی نہ ہنس کیونکہ چاندنی رات میں بابونہ کے پھولوں کی بہار مجھے از خود ......"

صفدر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگائیے

دردانہ "خوب پھر وہی شاعری۔ اے شہزادہ تونے یہ فن کہاں سیکھا اگر میں رات بھر ہنستی رہوں تو بھی شاید تیری نئی نئی تشبیہوں کا سلسلہ ختم نہ ہو۔ میں نے بھی ایک مرتبہ کوشش کرکے ایک شعر کہا تھا لیکن وہ بہت معمولی تھا"

نیروبی۔ "مجھے سناؤ، یقیناً وہ بہت اچھا ہوگا"

دردانہ "نہیں وہ نہایت ہی معمولی ہے۔ اس میں کوئی تشبیہ نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم تشبیہ کیسے استعمال کیجاتی ہے اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے"

نیروبی "تمھارے لئے معمولی بات ہوگی۔ لیکن میرے لئے تو ہر وہ لفظ سکونِ جان ہے جو دردانہ کی زبان سے نکلے"

دردانہ "مجھے شرم آتی ہے، تم سنکر مجھ پر ہنسوگے، اور ہاں اب تو مجھے وہ یاد بھی نہیں رہا کوشش کروں تو شاید صرف خیال ظاہر کرسکتی ہوں"

نیروبی۔ "اچھا وہی سہی، خیال ہی سہی"

دردانہ "ایک دن میں معبد میں دیوی زہرہ کے سامنے سر زمین پر رکھے ہوے رو رہی تھی کہ اس حالت میں مجھے نیند آگئی میں نے ایک خواب دیکھا جو نہایت دلکش تھا صبح کو نہایت مسرور اُٹھکر جب اپنا بربط میں نے لیا تو بے اختیار میری زبان سے ایک شعر نکل گیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ:-

"وہ لوگ جو میرے جسم کو چاہتے ہیں، ان سے کیوں کر کہوں میری روح
تو اس سے کہیں زیادہ حسین ہے، میرے چہرے کو بے نقاب دیکھنے
کی آرزو رکھنے والے کاش میری روح کو بیحجاب دیکھتے مگر افسوس کہ
موت پر جان دینے والے بہت ہیں اور زندگی سے محبت کرنے والے کم"

دیکھو میں کہتی نہ تھی کہ تم ہنسوگے، واقعی نہایت بھدا خیال ہے۔ شاعری کی اس میں کوئی بات نہیں پائی جاتی"

نیروبی۔ "مجھے دھوکا نہ دے۔ تو نے کبھی کوئی شعر نہیں کہا۔ میں ایسا بیوقوف نہیں، جو سمجھ نہ سکوں تو نے تو صرف مجھے سمجھانے کے لئے مجھ کو تنبیہ کرنے کے لئے ایک بات بنائی ہے یہ تو نے کیسے جانا کہ میں صرف تیرے جسم کا پرستار ہوں صرف تیری صورت کا شیدائی ہوں"

دردانہ۔ "ہاں یہ تم نے کیا کہا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، اس سے قبل جب کبھی تم نے مجھ سے باتیں کیں، میں نے ان کو ہمیشہ وہ التفات سمجھا جو ایک بادشاہ کی طرف سے غریب گداپر ہوا کرتا ہے مجھے تو کبھی اس کا وہم وگمان بھی نہ ہوسکتا تھا کہ والئے یونان کا بیٹا مجھ ایسی ذلیل وخوار ہستی کے لئے اپنی زندگی کا کوئی لمحۂ محبت کبھی صرف کرسکتا ہے تو کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ واقعی محبت کرتے ہو۔ میں کیسے یقین کروں"

نیروبی۔ "دردانہ یقین کرکہ وہ نیروبی جو ملک کی بہتر سے بہتر لڑکی کے ساتھ شادی کرسکتا ہے ایک زمانہ سے نیروبی دردانہ ہے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر یہ ۔۔۔ تھا مشہور ہوا ہے

اور ہر چند وہ اب تیرے چہرے کو بے نقاب نہیں دیکھ سکتا، لیکن تیرے حسن و جمال کے خوابوں سے اب بھی اس کی نیندیں معمور ہیں اور تیرے جلوؤں کی یاد سے اس کی راتیں روشن ——— ——— "

دردانہ۔"حسن و جمال! جلوہ!! میں ان کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہوں۔ کیا اچھی صورت کو حسن و جمال کہتے ہیں، چہرہ کا یاسمیں، رخسار کا گلاب، آنکھ کا نشہ، ابرو کی محراب، جسم کا تناسب، لبوں کی نازکی، دانتوں کی گوہر آبی، رنگ کی تازگی، جن کا ذکر اکثر شاعروں کی زبان پر رہتا ہے، کیا انہیں چیزوں کا نام حسن ہے۔ کیا انہیں باتوں کو جمال کہتے ہیں۔ اور کیا انہیں چیزوں کا بے نقاب ہو جانا جلوہ کہلاتا ہے، اگر دنیائے عشق و محبت کا فلسفہ صرف اس قدر ہے تو مجھے حیرت ہے کہ اس بے بنیاد جذبہ نے کیونکر ایسی وسعت حاصل کر لی۔ اور فطرت کیوں اپنی توہین گوارا کر رہی ہے۔ مگر آپ شہزادے ہیں اور آپ کے خیالات و جذبات بھی یقینی عام سطح سے بلند ہوں گے، اس لئے شاید آپ کے نزدیک "حسن و جمال" کا مفہوم اس قدر ادنیٰ و پست نہ ہوگا"

نیرو بی۔"بیشک عام شاعروں کے ہاں، ا، معمولی انسانوں کے نزدیک حسن و جمال کا مفہوم وہی ہے جو تم نے ابھی ظاہر کیا۔ لیکن میں تو ان لوگوں میں ہوں جو صورت سے زیادہ ادا کو دیکھتے ہیں جو اعضاء کے حسن سے زیادہ اطوار کی دلفریبی پر فریفتہ ہوتے ہیں اور غالباً یہی وہ چیز ہے جو تجھ میں بدرجہ کمال پائی جاتی ہے"

دردانہ۔"ادا! اطوار!! آہ شاعروں اور عاشقوں کی اصطلاحیں سمجھنا بھی کس قدر دشوار ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ میرا ذہن ان دونوں کے مفہوم سے بھی بالکل خالی ہے۔ اور شاید میں کبھی نہ سمجھ سکوں گی کہ ان کا حقیقی مطلب کیا ہے۔ کیونکہ اس سے قبل بھی بارہا جب میں نے شاعروں کے کلام پر غور کیا تو میں باوجود کوشش کے کبھی نہ سمجھ سکی کہ "ادا" اور اس کے ساتھ کے بہت سے الفاظ مثلاً غمزہ، کرشمہ، عشوہ، ناز، تیور، چتون، بانکپن، بھبن، وغیرہ کسے کہتے ہیں، اور ان میں کیا فرق ہے۔ آپ نے ابھی ادا اور اطوار کا ذکر کیا، اس لئے کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اگر آپ نے میرے اندر ان باتوں کو دیکھکر محبت کی ہے تو یہ چیزیں مجھ میں کہاں ہیں"

نیرو بی۔"دردانہ، تو یہ کیسی گفتگو کر رہی ہے۔ تجھ سی مکمل عورت جو یونانی اشعار عالیہ کی ماہر ہو، جو فنون لطیفہ میں اپنا نظیر نہ رکھتی ہو جو اچھی طرح اس حقیقت سے واقف ہو کہ سارا یونان اس کا فریفتہ ہے ایسی انجان بن جائے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں تو مجھ کو اس طرح بیوقوف بنا رہی ہے اور پھر اے تمنائے عالم مجھی سے پوچھتی ہے کہ ادا کسے کہتے ہیں۔ اچھا میں پوچھتا ہوں کہ تجھے چاندنی رات کیوں اچھی معلوم ہوتی ہے، تجھے اپنے بربط سے کیوں محبت ہے، تو موسیقی کی کیوں دلدادہ ہے اگر تو کسی اور طرح نہیں سمجھ سکتی تو یوں ہی سمجھ لے کہ تو میری چاندنی ہے، تو میری ہستی کا بربط ہے، اور میری روح کو بیتاب کرنیوالا نغمۂ شیریں"

دردانہ۔"چاندنی تو مجھے اس لئے اچھی معلوم ہوتی ہے کہ میں اس میں زیادہ جوش سے اپنے بربط کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتی ہوں اور اپنے ساز و موسیقی سے اس لئے لگاؤ ہے کہ یہ میری پرستش ہے، یوں سمجھ لو کہ چاندنی رات ستھرا فرش ہے، جسپر بیٹھنے کے بعد بربط کے تاروں پر میری انگلیوں کی لرزش اور گلے سے نکل کر آواز کی نیایش عبادت بن جاتی ہے، اور اگر آج میری دل سے

جب کبھی عطر کی ضرورت ہو فوراً اصغر علی محمد علی تاجر عطر کو لکھئے

یہ کیفیت محو ہو جائے تو میرے لئے ان میں سے ایک چیز بھی توبہ کے قابل نہیں رہ جاتی "

نیّر دبی "اے درِ دانہ، اے میرے دل کی دیوی، میں بھی تجھ سے محبت نہیں کرتا بلکہ تجھے پوجتا ہوں۔ میں نے غلطی کی کہ اپنے حال کو "محبت" کے لفظ سے ظاہر کیا۔ اور اس سے زیادہ غلطی یہ کی کہ تجھے حسین وجمیل کے لقب سے یاد کیا۔ حالانکہ تو اس سے بھی بلند کوئی اور چیز ہے جس کے ظاہر کرنے کے لئے انسان کے الفاظ عاجز ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اگر میں کہہ سکتا ہوں تو صرف یہ کہ تو میری معبودہ ہے، تو میری دیوی ہے۔ اور میں تیرا پرستار ہوں تیرا پجاری ہوں"

دردانہ "کیا یہ صحیح ہے؟ لیکن تم دردانہ کی پرستش کرتے ہو؟ یا میری؟"

نیّر وبی۔ "میں نہیں سمجھا، کیا دردانہ اور تو علیحدہ علیحدہ چیز ہیں؟"

دردانہ "ہاں، دردانہ نام ہے اس جسم کا جو اسوقت تمھیں نظر آرہا ہے، اور جو ہر وقت تغیر پسند و فنا پذیر ہے۔ اور میں تو یہ جسم نہیں ہوں"

نیّر دبی۔ "پھر کیا ہو؟"

دردانہ۔ "میں نام ہے فطرت کا، روح کا، وجدان کا، جس میں ہر وقت رفعت ہے، بلندی ہے، ارتقا ہے"

نیّر وبی۔ "تو پھر میں دردانہ سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ تجھ سے، تجھی کو چاہتا ہوں"

دردانہ "مگر ایک زمانہ آئے گا جب میری صورت خراب ہو جائے گی، دردانہ مکروہ ہو جائیگی کیا تم اس وقت بھی مجھ پر یہی محبت صرف کروگے؟"

نیّر وبی "یقیناً"

دردانہ۔ اچھا اگر یہ صحیح ہے تو پھر میرا فیصلہ یہی ہے کہ دردانہ، نیّر وبی کی ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن میں تمھاری ضرور ہوں اور پرسوں شام کو قدرت کی اسی خلوتگاہ میں اپنے آپ کو تمھارے سپرد کردوں گی"

نیّر وبی۔ اس وقت اپنے آپ کو صحیح معنے میں بادشاہ سمجھنے لگا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ دردانہ ایسی ہستی پر قابو پا لینا گویا دنیا فتح کر لینا ہے، اس لئے وہ غیر معمولی مسرت ونشاط کی کیفیت لئے ہوئے واپس گیا اور انتظار کے دو دن گذارنا اسکے لئے دشوار ہو گیا۔

....

(۲)

آفتاب غروب ہو چکا تھا، شفق کی روشنی ہاتوں کی حنا کی طرح آہستہ آہستہ مٹتی جارہی تھی اور نیّر دبی دو گھنٹے سے ساحل پر دردانہ کا انتظار کر رہا تھا، کہ شام کے دھندھلکے میں کچھ فاصلہ پر ایک نقاب پوش خاتون آتی ہوئی نظر آئی اور نیّر وبی اس کے لینے کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے دردانہ کی کمر میں ہاتھ ڈالدیا۔ لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس نے اس کا ہات اپنے ہات میں لے لیا، مگر وہ کچھ نہ بولی۔ اس نے اپنے جسم کو اس کے جسم سے بالکل ملا دیا لیکن وہ خاموش رہی۔ نیّر وبی کی مسرت کا اس وقت کیا اندازہ ہو سکتا ہے، وہ سمجھ رہا تھا کہ کائنات کی تخلیق ہی صرف اس کی آرزوئیں پوری کرنے کے لئے ہوئی ہے۔

عطر حنا جیسا اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملیگا دوسری جگہ نہیں مل سکتا

اور آج اُسے حق حاصل ہے کہ جس کو جس طرح چاہے جلائے

ساحل کی اُس چٹان پر پہنچکر جہاں اَب سے دو دن قبل عہد و پیمان ہوا تھا، دُردانہ نیرو بی سے علیحدہ ہو کر کھڑی ہو گئی اور بولی کہ "تم میری آواز پہچانتے ہو" نیرو بی بولا "کیوں نہیں کیا کوئی شخص ایسی شیریں آواز کو ایک مرتبہ سننے کے بعد اپنے دماغ سے محو کر سکتا ہے" دُردانہ نے کہا "تم میرے قد و قامت سے بھی مجھے جان سکتے ہو" نیرو بی نے کہا "خوب، کون ہے جو اس سروِ خراماں کا نظارہ کرنے کے بعد پھر اُسے فراموش کر سکے"

دُردانہ "میں نے گذشتہ دو راتیں معبد کے اندر صرف اس دعا میں صرف کر دی ہیں کہ اگر نیرو بی واقعی صرف میری روح سے محبت کرتا ہے تو میری صورت میں کوئی تغیر ایسا کر دیا جائے جو دنیا کے اس سب سے زیادہ انوکھے عہد و پیمان کی یادگار بن سکے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری یہ دعا قبول ہو گئی ہو گی۔ اس لئے میں نقاب الٹتی ہوں، میرے چہرہ کو بھی دیکھکر پہچان لو کہ واقعی میں دُردانہ ہوں یا نہیں؟"

یہ کہکر جس وقت دُردانہ نے اپنا نقاب الٹا اور نیرو بی کی نگاہ اس پر پڑی تو حیرت نے اس پر سکتہ طاری کر دیا۔ کیونکہ دُردانہ کے حسین چہرہ کے بجائے ایک ایسی کریہہ صورت اس کے سامنے تھی کہ مشکل سے وہ اُس کو نگاہ بھر کر دیکھ سکتا تھا تمام جلد پر گہرے چیچک کے داغ، ناک بیٹھی ہوئی، آنکھیں چھوٹی چھوٹی بھویں ندارد، پیشانی تنگ۔ ہونٹ موٹے۔ یہ تھا دُردانہ کا چہرہ جو نیرو بی کو نظر آیا۔

دُردانہ، دیر تک نیرو بی کے اس حیرت سے لطف اُٹھاتی رہی۔ اور پھر بولی "اے شہزادے جلدی کیجئے اور مجھے اپنے ساتھ لے چلئے۔ میں آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے کے سامنے اس کے پاکیزہ و مقدس جنگل میں عہد کرنے آئی ہوں کہ میں ہمیشہ آپ کی ہو کر رہوں گی۔ اور اپنی تمام روحانی برکتیں و لذتیں آپ کے لئے وقف کر دوں گی"

نیرو بی حیران تھا کہ سوائے چہرہ کے یہ عورت اور سب کچھ دُردانہ ہی تھی۔ لیکن اس کی صورت میں یہ تغیر کیسے ہو گیا۔ کیا واقعی اس کی دعا قبول ہو گئی۔ یا کسی اور عورت کو بھیجکر مجھے دھوکا دیا جا رہا ہے۔ وہ اس مسئلہ پر غور ہی کر رہا تھا کہ دُردانہ نے پھر تقاضہ کیا اور بولی کہ "اے شہزادے یہ سکوت کیسا، یہ حیرت کیوں، اپنے وعدہ کو بھول گئے، کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم میری پرستش کرتے ہو، ممکن ہے کہ میں دُردانہ نہ رہی ہوں لیکن میں تو ہوں۔ پھر یہ پس و پیش کیا؟"

نیرو بی جس کو اس کی گفتگو سے اب بالکل یقین ہو گیا تھا کہ وہ واقعی دُردانہ ہے اور اس کی صورت حقیقتاً مسخ ہو گئی ہے، تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا کہ "اے دُردانہ۔ نہیں اب میں تجھے دُردانہ نہیں کہہ سکتا۔ اے عورت! معاف کر، مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے اپنے جذبہ کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا اور ایک ایسا وعدہ کر لیا تھا جس کو میں اب پورا نہیں کر سکتا، میں تیری فطرت کا اب بھی شیدا ہوں۔ لیکن میں ایسے حسنِ باطن کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا، جو ایسے کریہہ ملبوس میں ظاہر ہو۔ میں تجھے اپنی بیوی بنا کر کیونکر مخلوق کو اپنا چہرہ دکھا سکتا ہوں۔ اور کس طرح اس تنفر و کراہت کو دور کر سکتا ہوں جو تیری صورت دیکھکر

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگائیے

میرے دل میں پیدا ہوتی ہے"

دُر دانہ یہ سن کر ہنسی، اور بولی کہ "اے شہزادے تمھاری خوشی میں نے تم کو مجبور نہیں کیا تھا بلکہ تمھیں نے میرے سامنے التجا پیش کی تھی۔ اس لئے یاد رکھو کہ اگر آئندہ کبھی تمھیں نقضِ عہد پر افسوس کرنا پڑے تو اس کا الزام مجھ پر نہ رکھنا"

دُر دانہ نے یہ کہا اور نقاب ڈالکر وہاں سے چلدی

(۳)

گذشتہ واقعہ کو دو ماہ کا زمانہ گذر گیا ہے، اور خانقاہ زہرہ کے احاطہ میں کسی مخصوص تقریب کی تیاریاں ہو رہی ہیں معبد زہرہ میں یہ رسم نہایت پابندی کے ساتھ جاری تھی کہ جس وقت کسی کنواری کی عمر ۱۹ سال کی ہوجاتی تھی تو عام جلسہ کیا جاتا تھا اور اس کو انتخاب شوہر کی اجازت دی جاتی تھی۔ چنانچہ آج دُر دانہ اپنی عمر کے ۱۹ سال پورے کر چکی تھی۔ اور اس کو خانقاہ کی پرستارانہ زندگی ترک کر کے متاہل زندگی میں داخل ہونا تھا۔

چونکہ دُر دانہ کے حسن و جمال، فضل و کمال کا بہت شہرہ تھا، اور اس تاریخ کا اعلان تمام قرب وجوار کے ملکوں میں بھی کر دیا گیا تھا، اس لئے خواہشمندوں کا ہجوم بہت تھا۔ اور ہر ملک کا امیرزادہ بہترین ہدایا لیکر حاضر ہوا تھا۔ نیر دبی اُس رات کی صبح ہی کو اپنا غم و غصہ دور کرنے شکار کے لئے چلا گیا تھا۔ اور پورے دو ماہ کے بعد اس رات کو واپس آیا جس کی صبح کو یہ تقریب عمل میں آنے والی تھی

اس نے سنا اور اپنے جی میں ہنسا کہ دیکھئے وہ کون بد قسمت ہے جو دُر دانہ کی شہرتِ جمال سے دھوکا کھا کر اس عذاب کو مول لیگا۔ صبح کو وہ بھی تماشہ دیکھنے گیا، لیکن لوگوں کو سخت تعجب ہوا جب اُنھوں نے سنا کہ نیر دبی جو دُر دانہ کا عدد درجہ شیفتہ تھا کوئی ہدیہ لیکر نہیں آیا اور فہرست میں اپنا نام بھی درج نہیں کرایا۔ کوئی پوچھتا بھی تو وہ ہنس دیتا اور کہتا کہ "ہاں دُر دانہ کی خواہش اب میرے دل کے اندر مردہ ہوگئی ہے"، لیکن جب اُس سے زیادہ اصرار کیا گیا۔ تو اُس نے اپنے بعض احباب سے اصل واقعہ بھی بتادیا اور رفتہ رفتہ یہ خبر دوپہر تک پوری طرح منتشر ہوگئی اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ فکر مند نظر آنے لگا۔ خانقاہ کے پجاریوں سے دریافت کیا گیا، وہاں کی اور کنواریوں سے جستجو کی گئی۔ لیکن سب نے یہی جواب دیا کہ اب سے دو ماہ قبل تو دُر دانہ کی صورت نہایت اچھی تھی۔ لیکن گذشتہ دو مہینہ کے اندر اس نے اپنے چہرہ پر نقاب کو بہت سنگین کر دیا ہے، اور کسی کو اس کی صورت دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ دیوی نے اس کی صورت مسخ کر دی ہو اور اس کی چھپانے کے لئے اس نے اپنی صورت دکھانے سے احتراز کیا ہو۔ رفتہ رفتہ یہ خبر اس قدر عام ہوئی اور اس درجہ لوگوں کو یقین ہوگیا کہ سب نے اپنی اپنی خواہشیں واپس لے لیں۔ اور شام کو جب صحنِ خانقاہ میں زرین تخت پر آکر دُر دانہ بیٹھی تاکہ ہر خواہشمند سامنے آکر اپنی التجا پیش کرے اور وہ اس کا جواب دے تو ایک متنفس بھی سامنے نہ آیا۔ نام پکارا جاتا تھا۔ لیکن مجمع سے نکل کر کوئی شخص آگے نہ بڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سارے نام ختم ہوگئے۔ فہرست میں اب صرف ایک نام رہگیا تھا۔ جو سب کے آخر میں اس لئے رکھا گیا تھا کہ وہ ایک نہایت ہی

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہیئے

معمولی کسان کے لڑکے کا تھا۔ جب سب نام ختم ہو گئے تو اس کا نام بھی پکارا گیا۔ اور وہ ڈرتا کانپتا آگے بڑھا اور تخت کے پاس پہونچکر بولا کہ "اے دردانہ میں نے تیری خواہش اس لئے نہیں کی تھی کہ تو حسین وجمیل ہے بلکہ صرف اس لئے کی تھی کہ دنیا میں مجھے ایک روح کی ضرورت تھی جو میری روح کی تڑپ کو دور کر دے اور مجھے سچی پرستش کا سبق دے۔ میں نے سنا تھا کہ تو بڑی بلند فطرت رکھتی ہے اور تیری پوجا سے زہرہ کی خانقاہ جگمگا اٹھتی ہے، پھر یہ بھی خدا کی قدرت ہے کہ اس نے تیرا ظاہری حسن وجمال چھین لیا۔ اور کوئی نوجوان تیرے ہات کا خواہاں آگے نہ بڑھا۔ یہاں تک کہ میرا نام پکارے جانے کی نوبت آئی۔ اس لئے میں حاضر ہوا ہوں۔ کیا تیری پاکیزہ روح میری آلودہ روح کے اتصال کو گوارا کر سکے گی؟"

مجمع پر ایک سکوت طاری تھا، اور ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھئے دردانہ کیا جواب دیتی ہے کہ نقاب کے اندر سے ایک نازک شیریں آواز آئی:۔

"اے اجنبی، چونکہ تو صرف میری فطرت کا گرویدہ ہو کر آیا ہے اس لئے یقیناً میں تیری خواہش کو رد نہ کروں گی"

اور یہ کہکر اُس نے اپنا نقاب اُٹھا دیا۔ کیونکہ انتخاب کی رسم ادا ہونے کے بعد ایسا کرنا ضروری تھا، لیکن نقاب کا اُٹھنا تھا کہ سارے مجمع میں ہلچل مچ گئی۔ کیونکہ اس وقت دردانہ بالکل چودہویں کا چاند معلوم ہوتی تھی اور اس کے حسن وجمال کی تاب نظارہ بھی لوگوں میں نہ تھی۔

نیروبی دیوانہ وار آگے بڑھا۔ اور بولا "اے دردانہ! یہ کیا ایسا سخت فریب!"

دردانہ مسکرا کر بولی "فریب تو تیری ہی مکروہ فطرت کا تھا جس نے اپنی صورت کو میرے چہرہ میں مشاہدہ کیا۔ ورنہ میں تو جیسی اب ہوں ویسی ہی اُسوقت بھی تھی"

یہ کہکر دردانہ اُٹھی اور کسان کے لڑکے کا ہات پکڑ کر اس گاؤں میں چلی گئی جہاں وہ رہا کرتا تھا۔

نیروبی جس وقت دیوانہ وار دردانہ کے حجرہ میں پہنچا تو وہاں اس کی کوئی چیز اُسے نظر نہ آئی، مگر ایک موی چہرہ جس پر نہایت ہی بد نما خط وخال بنے ہوئے تھے۔ اور جسے اِس نے اُس دن واقعی دُردانہ کا حقیقی چہرہ سمجھکر نفرت کا اظہار کیا تھا۔

نیاز فتحپوری

چھپ گیا چندروا رڈاردو شارٹ ہینڈ چھپ گیا
ایک ماہر زود نویس کی قابل قدر رائے
مکرمی شیخ صاحب۔ اسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ چندروارڈ اردو شارٹ ہینڈ کی کتاب میں نے بہ نظر تعمق پڑھی۔ واقعی کتاب سلیس اور مختصر سے مختصر لفظوں میں لکھی گئی ہے معمولی محنت اور تھوڑے وقت میں مبتدی ایک ماہر زود نویس بن سکتا ہے واقعی اس کتاب کی مدت سے ضرورت تھی والسلام۔ دستخط غلام حسن شارٹ ہینڈ رائٹر دفتر ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر جھنگ۔ ملنے کا پتہ الٰہ بخش رحیم بخش بک سیلر گجرات

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی شہرت حناسے ہوئی

انتساب حیات

ہوئی ہے دہر میں جنس وفا کی نایابی
اب ارتباط محبت کی آبرو نہ رہی
حیات شوق کی بیگانہ خیزیاں معلوم
دلوں میں شورش جذبات آرزو نہ رہی

صفائے قلب نہیں کشور تمنا میں
گداز درد نہیں آرزو کی دنیا میں

بدل گئیں ہیں زمانے کی حالتیں رزمی!
فسانہ بن گئیں اگلی صداقتیں رزمی!
جنوں طراز نہیں اب نہاد اہل وفا
اجل نصیب نہیں دل کی حسرتیں رزمی!
غرض نے لوٹ لی نقد حیات خودداری
ہوس نے چھین لیں دنیا کی غیرتیں رزمی!

فروغ شمع کی وہ شعلہ باریاں نہ رہیں
حیات قیس کی وہ ہرزہ کاریاں نہ رہیں

پھر اعتبار محبت کی آرزو کیوں ہو؟
مصیبتوں میں مسرت کی جستجو کیوں ہو؟

خزاں محیط رہے جب ریاض ہستی پر
نہال شوق ہو مرہوں بار و بر کیونکر؟

مگر وہ ایک جسے پیکر وفا کہئے
گل صبیح گلستان مدعا کہئے
متاع درد محبت کی آبرو جس سے
جسے نشاط تمنائے مبتلا کہئے
مے وفا سے ہے سرشار زندگی جس کی
باصطلاح محبت جسے "خدا" کہئے

اسی کے دم سے ہے ارمان زندگی مجکو
اسی کی یاد ہے سامان زندگی مجکو

سعید رزمی

فلسفہ محبت اور شاعرانہ انتقاد

دسمبر ۱۹۲۵ء کے نگار میں ابو النظر صاحب کا ایک مضمون "فلسفہ محبت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس پر میرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے اپریل کے نگار میں تنقید کرتے ہوئے ابو النظر کے خیالات سے اختلاف کیا تھا۔ اب ابو النظر صاحب نے جناب اثر کی تنقید پر نظر کی ہے اور اس طرح گویا یہ مضمون نقد التنقید کی حیثیت رکھتا ہے۔ (ایڈیٹر)

میں سب سے پہلے حضرت اثر لکھنوی کی تنقید کا شکریہ ادا کروں گا۔ کیونکہ میری دلی آرزو یہی تھی کہ اہل قلم اس کے محاسن و قبائح پر غور کریں، تاکہ میں خود بھی اپنی جگہ پر اس کے نقائص کو محسوس کرتے ہوئے دوسروں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے زرین موقعہ سے بہرہ انداز ہو سکوں۔ مجھے خوشی ہے کہ حضرت اثر نے اس طرف قدم اٹھایا۔

جواب دینے سے قبل میں اس بات کو بھی صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے "فلسفہ جمالیات" خالص مابعد الطبیعاتی اور الہیاتی نقطۂ نظر سے لکھا ہے (جو یورپ زدہ ذہنیت اور مادہ پرست دماغ میں نہیں آسکتا کیونکہ وہ ذرات کہربائی، قوت برقاطیسی، اور برق پاروں سے بلند تر پرواز کرنے کے ناقابل ہے) اور شعرا کا کام تمام حقائق نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ لہذا مجھ سے یہ امید رکھنا ہی غلط ہے کہ میں نے محبت کی ماہیت ذوقی ظاہر کرنے کی غرض سے ان کے دواوین کی مکمل چھان بین کی ہوگی۔ میں نے میر تقی کے کلام کا اقتباس صرف "انتخاب کلام میر" سے سرسری طور پر کیا تھا اور اسی طرح غالب کے دیوان کو بھی دیکھا تھا۔ اگر میں ہر غزل کو دیکھنے کی کوشش کرتا، تب بھی یہ ممکن نہ تھا کہ خاص طور پر کسی کی مدح سرائی اور کسی کی تحقیر کی جاتی۔ کیونکہ میر غالب سے بہتر ہوں یا غالب میر سے فلسفہ محبت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس کے علاوہ میں آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرونگا کہ مجھے اس امر کا "تصور" کہ میر و غالب میں سے کون بہتر ہو سکتا ہے مضمون دیکھنے کے بعد ہی پیدا ہوا کیونکہ میں اس قسم کے مباحث پر وقت صرف کرنا فضول خیال کرتا رہا ہوں۔ اگر غالب بہتر تھا تو ہندوستان کیا دنیا اس کے کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگی اور اگر میر "کوئی چیز" تھے تو دنیا ان کو سراہنے میں کبھی جانب داری سے کام نہیں لے سکتی۔ میرے آپ کے کہنے سے کسی کی قابلیت کا معرض خطر میں پڑجانا ممکن نہیں۔ مگر بہر حال جب ایک مسئلہ چھڑ گیا ہے تو اس پر اپنے خیالات پیش نہ کرنا بھی بے معنی ہوگا۔

میرے نزدیک میر تقی کی خصوصیت سیدھے سادھے جذبات و خیالات کو سادہ انداز میں ادا کرنا ہے اور غالب کا طغرائے امتیاز "تخیلات عالیہ حقایق نفسیہ اور فلسفیانہ گہرائیوں میں باہم یگانگت پیدا کرتے ہوئے پرجوش و پرشوکت انداز میں افکار حیاتیہ کو اس طرح بیان کرنا کہ پڑھنے والا بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ میری قوت متخیلہ روحانیت میں تحلیل اور سماویات میں سماتی جارہی ہے۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا پتہ صرف خاقانی ہے

مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے باوجود غالب کو مایہ ناز شاعر سمجھنے کے کسی کی تنقیص کے پہلو سے ایک حرف بھی نہیں لکھا اور نہ ایک فلسفیانہ طریقہ پر غور کرنے والے کو ویسا کرنا چاہیے تھا۔

حضرت اثر فرماتے ہیں کہ میر صاحب ایسے ایسے .... ہو کر بھی عشق سے بیخبر ہوں سخت تعجب ہے۔ مگر مجھے تعجب ہے کہ آپ کو تعجب کیوں ہوا۔ میر صاحب کی جس کسی نے بھی تعریف کی ہوگی بہترین شاعر ہونے کے لحاظ سے کی ہوگی جس کے آگے میں بھی سر تسلیم خم کرتا ہوں، اور اپنے مضمون میں ان کے اشعار کو وجدانیات کا ترجمان تسلیم کر چکا ہوں کیا اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ فلسفی ہوں اگر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ان کا پایہ بلند تر ثابت نہ ہو سکے تو کیا ان کی شاعری پر کوئی الزام عاید ہوتا ہے جبکہ آپ خود ہی فرما چکے ہیں کہ "شاعر کو منطقی مباحث سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا (گو اس فقرے میں فلسفی کی جگہ منطقی رکھنے میں تسامح سے کام لیا گیا ہے کیونکہ شاعر فلسفی ہو سکتا ہے منطقی نہیں۔ منطق صرف ایک ترازو کی حیثیت رکھتی ہے اور فلسفہ حقایق کونیہ، اعیان مجردہ غرض کہ روح و مادہ کے تمام رازہائے سربستہ کو وا شگاف کرنے کا دعویدار ہے) میری طرف یہ منسوب کرنا کہ میں نے ایک ہی شعر میں عشق کے مکمل فلسفہ کو بیان کرنے کی کوشش کی غالباً صحیح نہیں میں نے تو تین شعر نقل کیے ہیں۔ علاوہ اس کے ہر چند آپ کے نزدیک ایک شعر یا ایک سطر میں فلسفۂ عشق ہی نہ بیان کیا جا سکے مگر میرے خیال میں ممکن ہے۔ مکمل فلسفہ کلیات سے تیار ہوتا ہے۔ جزئیات کی تفصیل کو اس میں داخل کرنا غلط ہے۔ تخم مکمل ہوتا ہے۔ تنہ، شاخ، اور پتوں کی عدم موجودگی تکمیل تخم پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ بالکل اسی طرح کلیہ محبت کو بھی چند فقروں میں ادا کرنا غیر ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اسلامی فلاسفر ثمامہ کی ماہیت محبت اور میر انظریہ محبت ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں اور اگر اس قدر سختی سے گریز کرنا جائز ہو تو تب بھی میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ میر نے اپنے دفاتر شاعری میں "فلسفہ محبت" کو بہت ہی کم ہاتھ لگایا ہے اور آپ کے منقولہ اشعار میرے خیال کی تائید میں پوری قوت کے ساتھ پیش ہو سکتے ہیں۔

میرے اوپر اعتراض کیا گیا ہے کہ میرے نزدیک محبت درد ہے اور درد لذت بھی ہے اور غم بھی لہذا حد اوسط اڑا کر نتیجہ یہ نکلا کہ محبت لذت بھی ہے اور غم بھی۔ میں نے درد کو لذت اور غم دونوں لکھا ہے مگر کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ درد لذت اور غم تینوں کی حقائق متنوعہ یکساں ہیں۔ اثر صاحب! میں نے اس خیال کی وہیں پر یہ کہتے ہوئے تردید کر دی ہے کہ "درد بالخاصہ لذت ہے اور بالکیفیت غم" کیا اشیاء اور خواص اشیاء۔ اشیاء اور کیفیات اشیاء ایک چیز ہیں جس کی بنا پر "روغن لذت" سے "جوہر لذت" نہ جدا کیا جا سکے؟ اگر نہیں تو پھر اعتراض ہی کیا رہا۔ درد یا محبت جو عین لذت یا ذات غم نہیں روغن یا اور کچھ نہیں ہو سکتا، آخر کس فلسفہ کی رو سے؟ رہی "نئی اپج" تو صاحب! غالب کی مثال کو آخر کس "اپج" سے ادا کیا جاتا جب درد سے لذت پیدا ہوتی ہے اور لذت سے غم اور غم سے سویدائے قلب کو جلا ہوتی ہے اور اس کو سمجھانا ہے چراغ کی مثال سے تو کیا صورت اختیار کی جائیگی یقیناً درد کو بمنزلہ روغن کہنا پڑیگا، لذت کو بمنزلہ لو کے اور غم کو بمنزلہ دردِ آتش۔

اثر صاحب کا خیال ہے کہ میں نے غالب کی اس لئے تعریف کی کہ اس نے محبت کو "درد" کہہ کر آسمان کے تارے توڑے ہیں۔ حالانکہ یہ خیال غلط ہے یہ کون نہیں جانتا کہ درد کا لفظ اس قدر مبتذل ہو چکا ہے کہ آج شاعر اس وقت تک شاعر ہی نہیں ہو سکتا جب تک درد اس کی شاعری کو زینت نہ دے۔ اسی وجہ سے میں نے اپنے نزدیک شعر میں سوال و جواب دیکھ کر نہ کہ درد کا لفظ

عطر حنا ہندوستان میں مقبول ہے

دلچسپ اثر صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے جس شعر کی وجہ سے غالب کو عشق کا نفس شناس قرار دیا وہی میرے دعوی کی تردید کر رہا ہے، کیونکہ اس نے عشق و زیست دونوں کو درد کہا ہے اور اس لئے اب یہ کیسے ممکن ہے غالب کا جواب "بہترین جواب" کے نام سے یاد کیا جا سکے۔ کاش آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ دونوں درد ہیں مگر زیست صرف ایسا درد ہے جو مصیبت ہی کے معنی میں لیا جا سکے اور عشق ایسا درد ہے جو درد بھی ہے اور مصیبت بھی۔ کیا درد خود اپنے مستقل اور حقیقی معنی میں درد ہونے کے ساتھ ہی تکلیف دہ نہیں ہوتا؟ زیست کے لئے درد فقط معنی مجازی میں استعمال کیا گیا ہے اور عشق میں حقیقی اور مجازی دونوں قسم کے معنی لئے ہوئے ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ لفظ "بے دوا" کی وہ کونسی "اہمیت" تھی جس کی طرف اشارہ کی ضرورت تھی۔ درد عشق کو بے دوا کہنا درد اس طرح دردِ زندگی سے اس کو برتر ظاہر کرنا کسی خاص غور و فکر کا محتاج ہی نہیں اثر صاحب نے جو شعر کا مطلب بیان فرمایا ہے مجھے اس سے اختلاف نہیں۔ مگر ہاں اس کے ساتھ میں درد کے حقیقی معنی لیکر بھی ایک دوسری حقیقت کو غالب کی طرف نسبت کرنے کا ضرور مدعی ہوں۔ چنانچہ زیر بحث مضمون میں صرف اسی پر روشنی ڈالی ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ غالب نے عشق کے مرض اور اہم مرض ہونے نہ ہونے کے متعلق بھی کچھ لکھا ہے یا نہیں سو اس کی نسبت میں اپنی تصنیف "فلسفۂ جمالیات" کے مقدمہ سے مختصر سا اقتباس پیش کرتا ہوں:-

"اس ضمن میں اگر ہم یہ بھی ظاہر کرتے جائیں کہ غالب فارابی کا نہیں بلکہ بقراط کا پیرو ہے، تو شاید دلچسپی"
"کا باعث ہوگا۔"

"اب کو ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ بقراط کے نزدیک عشق نصف الامراض ہے اور عشق نصف الامراض اسی"
"وقت کہا جا سکتا ہے جب مرض کی دو قسمیں کی جائیں روحانی اور جسمانی اور پھر عشق کو بقراط کے نقطۂ نظر"
"سے روحانی مرض تصور کیا جائے۔ چنانچہ غالب بھی امراض کی دو قسمیں کرتا ہوا عشق کو روحانی مرض"
"ہی تصور کرتا ہے۔"

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے؟
غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا! غالب۔

"مگر اسی کے ساتھ اس نے اس کی بھی تصریح کر دی کہ روحانی مرض جسمانی مرض سے کہیں اہم ہے کیونکہ دنیا"
"کی ہر لطیف قوۃ ہر کثیف طاقت سے باعتبار لطافت اضافیہ قوۃ کا زیادہ مظہر ہوا کرتی ہے۔ جیسے بھاپ سے"
"برق زیادہ طاقت رکھتی ہے، غالب کہتا ہے۔"

کم جانتے تھے ہم بھی، غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم "ہوئے" پہ غمِ روزگار تھا

اب آپ "شاید" سمجھ گئے ہونگے۔ غالب عشق کے مرض ہونے نہ ہونے کے متعلق میر صاحب سے کہیں زائد علم رکھتا تھا کیونکہ فلسفہ کے نظریات اس کے سامنے تھے اور دل کا بر قمہ (Bulb) جوش محبت کے برقی شراروں سے لبریز تھا۔ چنانچہ آپ خود دیکھیں

اصغر علی محمد علی کا پتہ عطر حنا کافی ہے

اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ اقتباس دیکھنے سے پیشتر کیا آپ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ یہ دونوں شعر فلسفۂ محبت کے نظریات کا خاکہ ہیں؟ میر کا "بیمثل مطلع" یقیناً بہترین ہے۔ مجھے کوئی کاوش نہیں جو مخالفت پر اتر آؤں، مگر پھر بھی غالب کے شعر سے اس کا تقابل "مناسب" نہیں خیال کرتا۔ کیونکہ مختلف محاسن کا تقابل قلت تدبر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہر ایک اپنے رنگ میں نکھرا ہوا ہے۔ ایک کو دوسرے پر کسی ایسی صورت میں ترجیح دینا جب کہ دونوں جداگانہ نظریات کو پیش کر رہے ہوں درست نہیں ہو سکتا۔ غالب کہتا ہے :-

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

یعنی یہ کہ عشق زیست کا مزہ ہے۔ زندگی کی شیرینی ہے اور حیات انسانی کی بہترین لذت ہے۔ اگر کسی کا دل محبت کی ٹیس اور اس کی خلش سے خالی ہے تو یقین کرنا چاہیئے کہ اس کی زندگی، زندگی ہی نہیں۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ حیات صحیح معنی میں اسی وقت حیات کے نام سے یاد کی جا سکتی ہے جب محبت کی شیرینی اس کے نازک ترین حسیات لطیف ترین جذبات اور اعلیٰ ترین تخیلات کو پوری روشنی میں لاتے ہوئے حیات انسانی کا حقیقی مفہوم یاد دلا سکے۔ جس نے محبت نہیں کی وہ نہیں جانتا کہ زندگی کیا ہوتی ہے اور اس کی شیرینی کیسی؟ زندہ رہنے کی آرزو صرف محبت والا کر سکتا ہے دوسرا نہیں مگر چونکہ حیات کشمکش حیات ہی سے جاذب نظر ہونے کی قابلیت پیدا کیا کرتی ہے۔ اس لئے ممکن نہ تھا کہ لذت کے ساتھ غم کی کشاکش کشمکش حیات میں مبتلا نہ کرتی اس لئے انسان کی زندگی جہاں بہترین لذت و کامرانی سے ہمکنار ہے وہیں غم کی ناکامیاں بھی سایہ کی طرح پیچھے پیچھے ہیں۔

لہذا حیات انسانی کے تمام شعبہ ہائے گوناگوں پر ایک گہری نظر ڈالنے والے کے واسطے ضروری ہے کہ وہ تصویر کا کوئی رُخ خواہ رنگین ہو یا سادہ روشن ہو یا تاریک نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔

یہاں تک پہنچکر انصاف سے کہیئے کہ غالب نے کوننا حرف غیر مدبرانہ سپرد قلم کیا ہے اور کیا کوئی فلسفیانہ دماغ اور نکتہ شناس فطرت رکھنے والا اس سے بہتر لکھ سکے گا۔ اگر اس نے لذت کے ساتھ غم کی آمیزش سے بھی باخبر کر دیا تو کیا یہ کوئی غلط کاری تھی؟ دنیا کا کوئی حسن داغ سے اور اسکی کوئی لذت غم سے ناآشنا نہیں رہ سکتی کیونکہ اس کی تقویم میں بہ نسبت بسائط مجردہ کے مرکبات مادی کے اجزائے کثیف زیادہ تر شامل ہیں اور دنیائے فلسفہ میں یہ نظریہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ترکیب ہمیشہ بساطت کے مقابل پر کشمکش اور بے اعتدالی کا باعث ہوگا اور یہی غم کی علت اوّل ہے لہذا ایک حقیقت پرست اس صداقت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ لیجیئے میں اس مسئلہ کو نچلے درجہ کی مثالوں سے بھی ذہن نشین کرتا ہوں۔ اگر آپ نے فن تنقید کو غور سے مطالعہ کیا یا تنقیدات صحیحہ کو دیکھا ہے تو آپ کو علم ہوگا کہ کسی کتاب یا مصنف کی صرف خوبیاں ہی خوبیاں پیش کرنا ایک نقص خیال کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی ناولسٹ کسی ہیروئن کے تمام خد و خال کو ہر قسم کے داغ سے پاک رکھتے ہوئے اُسے جنت کی حور ثابت کرنے کی کوشش کرے تو اس کو اس بنا پر بہتر نہیں خیال کیا جاتا کہ کسی انسان میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ بالکل یہی معاملہ یہاں پر ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس کو چسپاں کرنے کی تکلیف آپ ہی گوارا فرمائیں۔

لہذا اگر میر صاحب نے صرف ایک ہی رُخ پیش کیا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اُس کو کس طرح "بیمثل" کہنے کی جرأت کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگانا چاہیئے

پرجوش عاشق جذبہ میں اس پر وجد کرنے لگے مگر ایک حقایق آشنا نیز ادب سے پوری پوری واقفیت رکھنے والا فلسفی اس پر مسرور نہیں ہو سکتا۔ رہی یہ بات کہ میر نہیں غالب کو جان پیاری ہے نہ معلوم آپ نے کہاں سے نکالا شاید اسے خود آپ ہی بہتر بتا سکیں گے۔

"بیخودی" پر غالب اور میر کے اشعار پیش کرتے ہوئے جس حد تک جذبات کی نمائش کی گئی وہ قابلِ افسوس ہے۔ غالب کے متعلق اس انداز میں اپنی رائے کا اظہار کہ "غالب بہکتے رہ گئے نہ زبان درست نہ بیان صاف" کبھی قابلِ ستائش نہیں کہا جا سکتا۔ ناقد کا اولین فرض ہے کہ وہ ہر لفظ "ذمہ دارانہ" ادا کرے یہ نہیں کہ جوش و ہیجان کے تحت جو کچھ زیرِ تسلیم آگیا وہی وحیِ آسمانی ہے۔ اردو زبان کے واقف کار کم از کم ہندوستان کے حدود میں تو بہت کافی ہیں۔

مگر میں نہیں دیکھتا کہ کسی نے غالب کی اردو کو نادرست کہنے کی جرات کی ہو اور اگر آپ کی رائے غالب کے بارے میں درست ہو تو مجھے ہندوستان کی علمی و ادبی ذہنیت پر ماتم گسار ہونا پڑیگا اس لئے کہ آج تک تقریباً ہر ایک زبان دان اور اہل زبان نے غالب کے خطوط کو ایک خاص طرز کا موجد اور غالب کے اشعار کو اردو کا قابلِ فخر ذخیرہ خیال کیا ہے۔

خیر مجھے دوسروں کے استحسان و استکراہ سے کیا غرض، مجھے تو خود اپنی جگہ پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہونا چاہیے۔ اثر صاحب نے غالب اور میر کا حسبِ ذیل ایک ایک شعر پیش کرتے ہوئے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی — غالب

بیخودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا — میر

غالب کے شعر سے متعلق چار سوال کئے ہیں جن کے جوابات مستقل طور لکھنا فضول ہیں بدین غرض غالب کے مدعا کو واضح کرنے کے ضمن ہی میں عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ وجودیات یا عوالم دو مختلف نوعیتوں کے ہیں۔ روحانی اور مادی پھر یہ کہ "ہم" یا "انا" دونوں کے افراد پر استعمال کیا جاتا ہے اور متنوع اعتبارات اضافیہ کے لحاظ سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ غالب نے بھی ہم نمبر (۱) اور نمبر (۳) انائے مجرد کے لئے استعمال کیا ہے اور نمبر (۲) جسمانی کے واسطے اب آپ غالب کی بلند ذہنیت کا علوئے تخیل دیکھئے کہ وہ عشق مجازی نہیں کیونکہ وہاں ایسا ہونا غیر ممکن ہے۔ بلکہ عشق حقیقی کے ایک درجہ کے رنگین کیف کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں روحانیت کے مدارج طے کرتے ہوئے ـــــــ اس مرتبہ تک پہنچ گیا ہوں جہاں تک کہ جسم اور جسمانی قوی (خواہ عالمہ ہوں یا عاملہ) کے ادراکات کا اثر بھی نہیں پہنچ سکتا کیونکہ روح اس قدر مجرد اور کثافت سے پاک ہو چکی ہے کہ اس کو جسم مادی سے کوئی خفیف سی مشاکلت بھی باقی نہیں رہی اور بغیر تشاکلت کے فلسفہ کے نزدیک کسی فاعل کا کوئی اثر منفعل پر اثر انداز نہیں ہو سکتا لہٰذا اس جسم کو انائے مجرد کے عوالم روحیہ، لذائذ روحیہ اور اس کی دیگر مخصوص کیفیات

اصغر علی محمد علی کے یہاں ہر قسم کا عطر ملتا ہے۔

جمالیہ کی خبر ہونا محال۔
خلاصہ یہ کہ جن حقائق تک میری شفاف روح فائز ہو چکی ہے اُن تک عقول متوسطہ کی رسائی کا تصور کرنا ہی غلط ہے خواہ میرے ہی تو اے عاقلہ کیوں نہوں حالانکہ وہ میری اندرونی کیفیت کا درست اندازہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ بہتر کر سکتے تھے نہ یہ کہ بیخودی کی سرمستیوں نے مسلط ہو کر دین و دنیا سے بالکل بیخبر کر رکھا ہے کیونکہ بیخودی میں یہاں اور وہاں کے امتیازاتِ مشخصہ کا احساس نفیِ انانیت کے سراسر خلاف ہے۔

ہاں میرؔ صاحب نے ضرور بیخودی پر اظہار خیالات کیا ہے مگر یہ نظر انداز کرتے ہوئے کہ نفیِ خودی پر انتظارِ خودی وجدانیات کی توہین اور محبت کا مضحکہ اڑانا ہے۔ جس حقیقت کا کلیتہً انتفاء ہو چکا پھر اُسی کا انتظار کیسا؟

رہا استفہام کا لطف اور بیخودی کا نگینہ کی طرح جڑا ہونا یہ محبت کی بات ہے۔ اور جذبات کی رنگ آمیزی غالبؔ و میرؔ کے ۲ دو شعر اور بھی پیش کئے گئے ہیں ؎

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہمکو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتا — میرؔ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا — غالبؔ

اثرؔ صاحب کے نزدیک غالبؔ کی منطقیانہ دلیل " اصولاً غلط ہے اور میرے خیال میں یہاں اصول کے لفظ کا استعمال ہی غیر موزوں ہے بہرحال اثرؔ صاحب کے نزدیک اس سے ثابت ہوتا ہے کہ " معاذ اللہ کچھ ہے تو خدا نہیں ہے "۔ حالانکہ اُن کو نہیں معلوم کہ نفی سے اثبات کا استدلال صرف اسی وقت ناقابل اطمینان ہو سکتا ہے کہ اثبات کے حدود مقرر نہوں۔ مگر جہاں وجود و عدم، روشنی و تاریکی اور سکون و حرکت کے سے متقابلات ہوں وہاں نفی سے اثبات کا استدلال کس طرح ناقابل اطمینان ہو سکتا ہے؟

حضرت اثرؔ کے نزدیک اثر نہ رہنے کی بناء پر شاعر کو استدلال " بیر " ہے۔ کیا شاعری اور عدم شعور مترادف خیال کئے گئے ہیں؟ ورنہ مدلل بات کا تو اثر زیادہ ہونا چاہئے جو شاید غالبؔ کی ممتاز ترین خصوصیت ہے؟ اور کیا شاعری جذبات کے حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی؟ " فلسفۃ الشعر " پر کچھ خامہ فرسائی کیجئے تاکہ دنیا کو شعر و شاعری کی حقیقت پر غور کرنے کا موقع ملے۔

اثرؔ صاحب کے نزدیک غالبؔ بھی وہی کہنا چاہتا ہے جو میرؔ صاحب فرما چکے ہیں مگر " نہایت بھدّے طریقے سے " اوّل تو یہ کہنا کہ میرؔ و غالبؔ ایک ہی کہہ رہے ہیں۔ شاید بہت دور کی نسبت سے درست ہو سکے اور دوسرے غالبؔ کے انداز بیان کو " بھدّا " بتانا شاید حسنِ ظن " کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

حضرت اثرؔ کے نزدیک غالبؔ کو یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ " میں نہ ہوتا تو خدا ہوتا " آخر ہمت نہ ہونیکا مطلب؟ کیا یہ کلمۂ کفر ہے؟

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر خریدیے

غالب کم ہمتی کی بنا پر استفہام کے پیرائے میں نہیں کہہ رہا اس لئے کہ اُس کا نظریہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ کوئی فلاسفر انکار کی جرأت ہی نہیں کرسکتا بلکہ وہ دوسرے لوگوں کے قوائے ذہنیہ کی گہرائیاں یا کران کی دنیائے فلسفہ کے سامنے نمائش کرنا چاہتا ہے چنانچہ نتیجہ معلوم۔

اصل میں آپ اس کا مطلب ہی نہیں سمجھے وہ "نیست سے ہست" ہونے کا مسئلہ ثابت کر رہا ہے۔ عام فلاسفہ کے نزدیک عدم محض سے وجود کا امکان نہیں۔ مگر وہ بتاتا ہے کہ ممکن اور بہت ممکن ہے کیونکہ جب یہ تسلیم کرلیا گیا کہ کائنات کی آفرینش کا باعث اول صرف خدا ہے اور عدم محض سے وجود میں لانا صرف قوۂ متخیلہ و قوہ ارادیہ کا فعل ہے۔ تو یقیناً اُس نے قوۂ ارادیہ ہی سے پیدا کیا ہوگا اور صفات باری عین ذات ہیں۔ اس لئے اگر کائنات اپنی بسیط اور مجرد محض ہیئت میں رہتی تو یقیناً اس کو عین ذات کی بجائے کچھ اور کہا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اور جب کائنات عین ذات ہوئی تو چونکہ میں بھی اس کا ایک جز ہوں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عین ذات نہوتا۔ کیا یہ باتیں کفر ہیں اور تثلیث پر حملہ جس کے تصور سے آپ کو تعوذ کی پناہ میں آنا پڑا حالانکہ وہاں پر "فقط" یا "صرف" کا لفظ محذوف ہے یعنی "کچھ" ہے تو فقط یا صرف خدا نہیں ہے" بلکہ تعینات بھی شریک ہستی ہوگئے جنھوں نے وحدت کو کثرت اور دوئی میں تبدیل کردیا۔

یہ مسئلہ مستقل عنوان چاہتا ہے ضرورت ہوئی تو روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ مولانائے اثر کیا آپ انصاف سے کہہ سکتے ہیں کہ میر صاحب کے شعر سے اس مضمون کا شبہ بھی ہوتا ہے کہ "اس احساس وادعاء خودی نے کہ ہماری ہستی مطلق سے علیحدہ ہے ڈبو دیا" کیا میر صاحب کی "آرزو" اور آپ کا "احساس خودی" مترادف ہیں؟ آرزو تو احساس خودی کا نتیجہ ہے نہ کہ خود احساس خودی۔

غالب پر یہ اعتراض کہ:۔

"میرا وجود میرے خدا ہونے کے منافی ہے لہذا یہ رونا بیکار کہ ڈبویا مجکو ہونے نے کیونکہ میرا ہونا پھر نہ ہونے میں منتقل"
"ہوجائیگا۔ یہ مرنا ہوا فنا نہوئی اور قرب خدا یا وصل خدا حاصل نہیں ہوسکتا جب تک انسان زندگی میں اپنے آپ کو نہ مٹادے"
"یہ گوشہ میر کے شعر میں موجود اور غالب کے ہاں مفقود ہے۔"

کس قدر سخت غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ اوّل تو آپ کا یہ خیال ہی قطعاً درست نہیں کہ "میرا ہونا پھر نہ ہونے میں منتقل ہوجائیگا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ آپ "ہونیکا" مفہوم سمجھے نہ "نہ ہونے کا"۔ جو انسان کہ ایک مرتبہ پیدا ہوچکا وہ کبھی نہ ہونے میں منتقل نہیں ہوسکتا۔ انسانی وجود چند مختلف ذرات عنصری کا نام نہیں کہ شیرازہ بکھر جانے پر وجود عدم میں تحلیل ہوسکے بلکہ وہ حقیقتاً روح انسانی کا نام ہے جو ایک مرتبہ حضرت الہیہ کی قوۂ ارادیہ سے "عکس پذیر" ہوکر فنا کی چاشنی سے ناآشنا ہوچکی اور باور کیجیے کہ زمانہ کی کسی انقلابی کروٹ سے اس کا بسیط و مجرد وجود پارہ، پارہ نہیں ہوسکتا لہذا غالب کی نوحہ خوانی کبھی "بیکار" اور غیر موثر نہیں رہ سکتی۔ نہ معلوم آپنے موت اور فنا کے معنی حقیقی لئے ہیں یا مجازی۔ مجازاً تو ہر ایک دوسرے کی جگہ پر بولا جاتا ہے اور حقیقی معنی لینے کی صورت میں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ باوجود ہونے کے نہ ہونے میں منتقل ہوجانے کے یعنی باوجود موجود کے معدوم ہوجانے کے کیوں اس کو مرنا کہا جائیگا نہ کہ فنا۔ حالانکہ موت تو محض حضرت ربوبیت کے ارادہ تصوری کے انقطاع وجودی یا قریب الفہم الفاظ میں روح کے جسم سے علیحدہ ہوجانیکا ہی نام ہے۔ اور فنا انقطاع عدمی یا ہونے کے نہ ہونے میں منتقل ہوجانے کو کہتے ہیں۔

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

اگر یہ گوشہ غالب کی محلسرا میں نہیں تو نہ سہی۔ اس لئے کہ غالب کا وہ مدعا ہی نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ غضبناک ہونیکی کوشش نہ کیجئے کیونکہ میں حقایق پیش کر رہا ہوں، نہ کہ جذبات کی رنگینی۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ مضمون کا تو جوش پر ہے اور نگار کی گنجائش محدود۔ چنانچہ اس کا تلخ تجربہ "فلسفہ محبت" کے مضمون کی دلخراش اور سخن کُش قطع و برید سے ہو چکا ہے، مگر اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتے ہوئے نیاز صاحب کی "بے نیاز فطرت" سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے ابھی کچھ اور بھی عرض کرنے کی اجازت دیں۔ اس لئے کہ اگر میں نے کسی بات کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دیا تو اُس کو بجائے اختصار کے میری کمزوری خیال کیا جائیگا، گو ظاہر ہے کہ چند اوراق کا اضافہ کر دینے پر بھی جوش طبع کی شعلہ سامانی کم نہیں ہو سکتی۔

حضرت اثرؔ نے غالبؔ پر دوسرا نقص وارد کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے کہ خدا سے جُدا ہونے کے مسئلہ کا حل میرؔ صاحب کے ہاں موجود ہے یعنی "ہم سراپا آرزو ہیں اور آرزو میں کمی و نقص کا خیال مضمر ہے" کیا اسی کو حل کہا جاتا ہے جبکہ ہنوز اس سوال کا جواب نہیں دیا گیا کہ خدا بندہ کس طرح ہوا اور ہم کیسے جُدا ہو سکے۔

اس شعر سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جُدا ہونے کے بعد وجود تمنا کے باعث آج پھر ہمارا خدا سے وصل نہیں ہو سکتا۔ مگر دوبارہ عدم وصل کی علت بیان کرنے سے پیشتر تو یہ بتانا چاہیئے کہ فراق ہی کیوں ہوا تھا۔ اگر خدا میں بھی آرزو ہی پیدا ہوئی تو جواب مکمل ہو گیا۔ اور اگر آرزو دلیل احتیاج ہوتے ہوئے خدا میں نہیں پیدا ہو سکتی تو پھر کچھ اور سوچنا پڑیگا۔

آپ فلسفیانہ ذکر نہ چھیڑیئے ورنہ میرؔ صاحب کی لغزشیں قدم قدم پر محسوس ہونے لگیں گی کیونکہ در اصل انہوں نے صرف سادہ جذبات سے بحث کی ہے۔ جس کی رو سے حرف گیری کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن آپ یہ دکھاتے ہوئے کہ گو غالبؔ سے فلاں فلسفیانہ سوال کا جواب نہ دیا گیا مگر میرؔ صاحب کی ذہانت فتحیاب ہو سکی۔ بیچارے میرؔ صاحب کو فلسفہ کی دشوار گزار گھاٹیوں اور عقلیات کی پرخار وادیوں میں ٹھوکریں کھانے کے واسطے بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ رہا غالبؔ کا جواب وہ پچھلے صفحات میں آپ کی نظر سے گزر چکا ہوگا

ہمارے اثرؔ صاحب نے میرؔ کا ایک اور شعر بھی فلسفۂ آرزو کی گتھیاں سلجھانے کے لئے پیش کیا ہے ؎

لایا ہے میرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیٔ رازِ نہاں ہوں
میرؔ

جو سرسری نظر میں یقیناً بہت مکمل معلوم ہوتا ہے مگر ایک فلسفی کی گہری نگاہیں بہت کچھ تلاش کر سکتی ہیں۔

اگر اس شعر کو درست سمجھ لیا جائے تو اُس کے معنی یہ ہوں گے کہ پس پردہ مطلع بالکل صاف ہے کیونکہ جب پس پردہ آپ ہی آپ تھے اور آپ کا شوق آپ کو باہر نکال لایا تو اب اس جلوۂ مادیہ کے شہود پر، خلوۃ روحانیہ "صحیح" معنی میں خلوۃ ہی ہو گئی جس کے معنی سادہ الفاظ میں یہ ہوئے کہ نعوذ باللہ خدا نہیں اور اگر ہے تو آپ ہی کی ہیئت کذائی۔ آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ تخیل کفر ہے یا غالبؔ کا "کچھ نہیں"

اثرؔ صاحب نے اس شعر کی تصریح بھی کی ہے جسے ایک بڑی حد تک بے ربط کہنا جائز ہوگا۔ میرؔ صاحب اپنی مستقل حیثیت ثابت

ہر عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

کرتے ہیں اور اثر صاحب "پرتو" فرماکر اُسے اعتباری و اضافی ظاہر کرنا چاہتے ہیں اثر صاحب منشاء اولین کی توضیح فرماتے ہیں مگر میر صاحب کا شعر اس منشاء سے قطعاً روشناس نہیں۔ علیٰ ہذا "معرفت سے انسان کا انسان نہ رہنا" بھی شاید میر صاحب کے مافی الضمیر کی ترجمانی نہیں۔ کیونکہ شعر میں اس کے متعلق کسی قسم کا اشارہ نہونے کے علاوہ عقلاً بھی یہ نظریہ درست نہیں ہوسکتا معرفت کی ترقی تو انسان کو انسان بناتی ہے نہ کہ انسانیت سے خارج کرنے والی معرفت نفس تو صرف معرفت الٰہی کا باعث ہوتی ہے بھلا اُس میں خدا بنانے کی قابلیت کہاں؟ دوسرے حسنِ ازل میں جذب ہونیکا تصور کرتے ہوئے اثر صاحب کو غور کرنا چاہئیے کہ قدیم فلسفہ کے دوراز کار نظریات کا کس قدر بیجا تتبع اور اسلامی تعلیمات سے بے راہروی کا کتنا بین ثبوت پہنچا رہے ہیں نہ صرف اسلامی فلسفہ بلکہ کوئی فلسفیانہ دماغ جذب الی الکل کے نظریہ کو حقیقی معنی میں درست نہیں خیال کرسکتا۔ اس لئے کہ جو امتیاز خدا اور بندے کے درمیان پیدا ہوچکا وہ خواہ اضافی ہی کیوں نہ ہو مگر جب تک کہ قیامت نہیں آتی خالق و مخلوق کے فروق کو تسامح کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ کبھی عالمِ روحانی، عالمِ مادی، عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت کی تمام تحلیلاتِ کیمیاوی اور اُن کی ساری انقلاب انگیزیاں من و تو کے امتیازات کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی مٹا سکتی ہیں۔ غرض یہ کہ جذب الی الکل کے صرف یہی معنی لئے جاسکتے ہیں کہ "انسان انسان رہکر" اپنے آپ کو بالکل خدا کے سپرد کرتے ہوئے اپنی بہترین محبت و یگانگت کا پورا پورا ثبوت دے سکے اور بس۔

محترمی! میں آپ کی خاطر سے یہاں تک تسلیم کرتا ہوں کہ غالب کا انداز نہ صرف منطقیانہ بلکہ خشک منطقی جیسا ہے۔ مگر یہ تو بتائیے کہ رموزِ فطرت کا اطلاق کس نوعیت کے حقایقِ نفسی پر کیا جاتا ہے۔ تاکہ پھر اسی معیار کو سامنے رکھکر اس کا یقین حاصل کیا جاسکے کہ میر صاحب رموزِ فطرت بیان فرمارہے ہیں۔ یا غالب اور حقیقت سر پرست غالب۔

جناب اثر حسب ذیل شعر ؎

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا — غالب

کا مطلب بیان فرماتے ہوئے تمہید میں میرے بیان کردہ معنی کو جس تمسخر آمیز پیرایہ میں پیش فرماتے ہیں اس کے متعلق صرف اس قدر عرض کروں گا۔ کہ یہ طرز عبارت فنِ تنقید سے ناواقفیت کا بین ثبوت ہے آپ کو میری تحقیق پر نرم لہجے میں صرف جرح قدح کرنیکا حق تھا نہ کہ مضحکہ انگیزی کا۔ بہرحال چونکہ میں باوجود "منہ میں زبان رکھنے کے" ترکی بہ ترکی جواب دینا نہیں چاہتا بدیں وجہ محض آپ کے بیان کردہ معنی پر "کچھ" روشنی ڈالنے کی کوشش کرونگا۔

آپ نے ایک طویل و عریض تمہید اور بحث طلب دعادی کے بعد نتیجہ "داغ ڈالنا" اور اسی کا نقش سویدا ہونا ظاہر کیا ہے مگر نتیجہ غلط لہٰذا خود سمجھ لیجئے کہ اس شکل کے صغریٰ کبریٰ کہاں تک درست ہوں گے۔ نتیجہ کی غلطی اس بنا پر ظاہر ہے کہ اثر صاحب عشق سے داغ

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

ڈال رہے ہیں" اور غالب عشق سے نقش سویدا درست" کر رہا ہے۔ یعنی اُس کے نزدیک داغ کا نفسِ وجود و دودِ آہ کا مرہونِ منت نہیں بلکہ وہ تو صرف اُس کی رونق و زینت کو دوبالا کرنیوالا کہتا ہے۔ ممکن ہے کہ اثر صاحب کو سرمایۂ دود" سے اشتباہ پیدا ہوا ہو جو نہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ داغ کی چمک اور دل کی دلچسپیاں دودِ عشق ہی کی دولت (سرمایہ) کے پورے حسن و شباب پر آسکتی ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ بغیر کسی حسن سے محبت کئے بھی زندگی مسرت اندوزیوں سے یکسر خالی نہیں بتائی جاسکتی اس لئے حقیقت نگاری یہی ہو سکتی تھی کہ عشق کی اہمیت کو مبالغہ آمیزی سے پاک رکھتے ہوئے اُس کی پوری پوری تصویر اتاری جائے چنانچہ غالب اس کا لحاظ رکھتے ہوئے عشق کو داغ ڈالنے والا نہیں کہتا بلکہ داغ درست کرنیوالا اور اُس کو پر رونق و دل آویز بنانے والا بتاتا ہے۔

اثر صاحب سے میں سفارش کروں گا کہ وہ سب سے پہلے غالب کی ذہنیت کا اندازہ کریں پھر اسی کے مطابق مقصد متعین کرنے کی کوشش کی جائے ورنہ کامیابی معلوم۔

اثر صاحب نے میر کا ایک اور شعر بھی غالب کے مقابلہ پر تحریر فرمایا ہے ؎

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جسجگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا — میر

حالانکہ میرے نزدیک یہ شعر میر صاحب کی کہنہ سالی سے پیدا ہونیوالے جذبات کے تحت لکھا گیا ہے جس سے بجائے قوۃ عمل کو تحریک ہونے کے اُن کی مخصوص کمزور فطرت کا راز فاش ہوتا ہے کیونکہ کل جہاں پر درد تھا وہاں پر داغ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ دل تپش سوزش اور آشفتگی کو برداشت نہ کرسکنے کی وجہ سے آتش زدہ ہو کر خاک ہو گیا۔ پھر اُس خاک کے ذرات فضائے آسمانی میں پھیل گئے اور نشانی کی طور پر داغ ہی داغ رہ گیا۔

غور کیجئے کہ نبرد آزمائی کے بعد اس قدر سخت پسپائی اور شکست فاش کیا ایک جوان مرد کے لئے قابلِ فخر ہو سکتی ہے؟ نہیں اور کبھی نہیں۔ اس کے مقابلہ پر غالب کی بلند آہنگی اور شعلہ آشامی دیکھئے جس کے لفظ لفظ سے جوشِ مردانگی ظاہر ہوتی ہے ؎

دہکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا — غالب

تنازع للبقوۃ کے میدانِ جہاد میں اس سے بہتر کونسا نعرہ ہو سکتا ہے۔ رہا تنافر اور تکرار و اعادہ کی عدم فصاحت سو اس کو آپ کے جذبات کی حد تک میں تو تسلیم کرسکتا ہوں۔ مگر دنیا اُس وقت سر تسلیم خم کریگی کہ تنافر کی تعریف اور تکرار کے غیر فصیح ہونے کے حدود مقرر کردئیے جائیں کیونکہ قرآنی تکرارات تحسین و آفریں کے مستحق خیال کئے جاتے ہیں۔

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہیے

آخر میں میر صاحب کے صرف مختلف اشعار پیش کئے گئے ہیں جن پر میں محض عدم گنجائش کی مجبوری سے کچھ نہ لکھنے پر مجبور ہوں۔ ورنہ باور کیجیے کہ بہت کچھ لکھا جاسکتا تھا۔ کیونکہ حضرت اثر کی بدولت مجھے میر صاحب کے اشعار پر فلسفیانہ نقطہ نظر سے غور کرنیکا کافی موقع ملا ہے۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس رنگ میں وہ غالب کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے اُن کے حدود شاعری کو اپنے زمانہ کی اردو میں سادہ جذبات ادا کرنے سے متجاوز کر دینا انتہائی ستم ظریفی ہوگی آئندہ آپ کو اختیار ہے ؎

تھی گرم خبر کہ غالب کے اڑینگے پرزے

دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشہ نہ ہوا

کاش آپ اس تنقید سے جو لارڈ مکالے کے انداز میں پیش کی گئی ہے بجائے مشتعل ہونے کے سکون و طمانیت کے ساتھ بہرہ یاب ہونیکی "سعی حاصل" کر سکیں اس لئے کہ میرا حقیقی مدعا خدانہ کردہ کسی کی توہین کرنا نہیں بلکہ اصل حقیقت کی رسم "نقاب کشائی" ادا کرنا ہے اور بس۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ میری ان غیر متعصبانہ باتوں کا (جو مسلسل دو ماہ کی علالت سے متاثر ہو کر آپ تک تاخیر سے پہنچ رہی ہیں) جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے یا نہیں مگر اس پر بھی مجھے اپنا فرض منصبی ادا کرنے سے باز نہ رہنا چاہیے۔

تاہم مضمون کو ختم کرتے ہوئے اثر صاحب کے متعلق غالب ہی کی زبان میں یہ عرض کرنے کی ضرور گستاخانہ جرأت کرونگا ؎

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا

اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ابوالنظر رضوی امروہوی

تصنیفات مولانا نیاز فتحپوری

نگارستان عگر	گہوارۂ تمدن عگر
صحابیات ۱۲ر	شہاب کی سرگزشت عمر

مندرجہ بالا کتابیں اگر بذریعہ وی۔ پی منگائی جائیں گی تو محصول میں علاوہ محصول اور اگر چھ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجے جائینگے تو مع محصول چھ روپیہ میں بھیجدی جائیں گی

منیجر نگار بھوپال

بندگیِ شکم

شام غربت کا سماں کتنا تحیر خیز ہے　　　اک سکوت یاس سے ساری فضا لبریز ہے
ہے شفق کے خون سے معمور مینائے فلک　　　مشہدِ عشاق کا دامن ہے پہنائے فلک
دم بخود ہیں ساکنانِ لالہ زار و رود بار　　　چھپ رہے ہیں شام کی ظلمت میں دشت و کوہسار
موج مضطر ہے کہیں دریا کی تہ میں گوشہ گیر　　　صفحۂ صحرا پہ ہے جادہ کی مدہم سی لکیر،
آدمی کا دشت و صحرا میں نشاں تک بھی نہیں　　　رہنمائی کو غبارِ کارواں تک بھی نہیں
شام کے زور فسوں سے خشک و تر خاموش ہیں　　　ہے ہوا حیرت زدہ برگِ شجر خاموش ہیں

ایک حسرت ہے گل و گلزار پر چھائی ہوئی،
دہر کی ساری فضا گویا ہے گھبرائی ہوئی

آہ یہ مایوس منظر خوں رلاتا ہے مجھے　　　عالم غربت میں دیوانہ بناتا ہے مجھے
روتی ہے شبخو پردہ میں خوں جو چشم اشکبار　　　ڈالتی ہے اس بیاباں میں بنائے لالہ زار
بستے ہیں صحرا نوردوں سے بھی کاشانے کبھی　　　ہوتے ہیں آباد دیوانوں سے ویرانے کبھی
صبح کے روئے حسیں میں بھی وہی انداز ہے　　　طائروں کی بھی وہی لذت فزا آواز ہے
ہیں رواں نہریں اسی انداز سے مستانہ وار　　　ہے اسی طرح زمیں پھولوں سے دامانِ بہار
شب کی ظلمت میں بھی ہے اندازِ لیلائی وہی　　　صبح کے تارے میں بھی ہے شانِ رعنائی وہی
ہے وہی سبزہ کی چادر کوہ و صحرا کے لئے　　　ہیں وہی دلکش مناظر چشم بینا کیلئے
ڈھانپ لیتی ہے وہی کالی گھٹا افلاک کو　　　کرتی ہے گلگوں اسی صورت جہانِ خاک کو

جس کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں وہ مگر ملتا نہیں،
جس پہ گھستی ہے جبیں وہ سنگِ در ملتا نہیں

بھولنے والا نہیں ہے لطفِ ایامِ وطن　　　یاد ہے اب تک مجھے صبحِ وطن شامِ وطن
چھوڑ دوں صبحِ وطن شامِ غریباں کیلئے　　　ایسے گلشن کو بھلادوں اس بیاباں کیلئے

کارخانہ اصغر علی محمد علی تمام دنیا میں مشہور ہے

دشتِ غربت میں ہوں اپنے وطن سے دور ہوں　　کس قدر تقدیر کے قانون سے مجبور ہوں
میں سمجھتا تھا کہ ہوں میں اس گلستاں کی بہار　　میرے آبِ گل سے ہے محکم بنائے روزگار
جلوۂ دلکش لیا ہے مجھ سے صبح و شام نے　　پرورش پائی ہے میری گود میں ایام نے
میرے ہی دامن کا سایہ محفلِ دنیا پہ ہے　　منحصر دورِ فلک گویا مرے ایما پہ ہے
میرے لالہ زار سے ہوتا ہے پیدا آفتاب　　ابر پاتا ہے مرے فوارۂ گلشن سے آب
نونہالانِ گلستاں میں مرا انداز ہے　　نغمۂ بلبل بھی میرے ساز کی آواز ہے
دل مرا نالاں نہیں ہے آنکھ میری تر نہیں　　ایک میں ہوں اور کوئی دہر میں سرور نہیں

صورتِ اختر فضائے دہر میں خنداں ہوں میں
حاصلِ کونین ہوں سر جلوۂ امکاں ہوں میں

آہ تھے سب بے حقیقت یہ خیالاتِ بلند　　ہے شکم سے درد آگیں آدمی کا بند بند
فکرِ روزی سے ہر اک فردِ بشر مجبور ہے　　دامِ کلفت میں پھنسا ہے عافیت سے دور ہے
"مسلمِ ہندی شکم را بندۂ" خوش گفتہ است　　"خود فروشے دل ز دیں برکندۂ" خوش گفتہ است
اس خراب آباد میں آزادِ غم کوئی نہیں　　کوہ میں صحرا میں محرمِ شکم کوئی نہیں
سر فروشِ عشق کی آغوش میں پنہاں شکم　　انبیا کے بھی تہِ دامن جفا سامان شکم
کس جگہ اس نے مصیبت کی بنا ڈالی نہیں　　نازنیں کا دل بھی اس کی فکر سے خالی نہیں
ہے اسی سے دہر میں ہنگامۂ تیغ و تفنگ　　ہے اسی سے بھائی بھائی برملا سرگرمِ جنگ
پاکبازوں کو حرم سے دور کر دیتا ہے یہ　　کارِ بد پر روح کو مجبور کر دیتا ہے یہ
بھیجتا ہے قعرِ دریا میں شناور کو بھی　　ہند میں لاتا ہے یوناں سے سکندر کو بھی
آدمی کو سینۂ قلزم پہ دوڑاتا ہے یہ　　خاصۂ خاصانِ حق سے تنگ ہوتا ہے یہ
درحقیقت کعبۂ آفاق میں بت ہے یہی　　کفر اور ایمانداری میں تفاوت ہے یہی
کوئی اس کی سرکشی کی تاب لا سکتا نہیں　　اس کے جوشِ حشر آرا کو دبا سکتا نہیں

پتھروں سے باندھ لیتا ہے مگر ایماں اسے
یعنی کر لیتا ہے اپنا تابعِ فرمان اسے

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگائیے

تاج آگرہ اور مسٹر ہکسلے

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجیے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے
غالب

مشرق کی بدنصیبی دیکھیے، کہ آج اُس کے مجنوں صحرانوردی کی بجائے، آرام کرسیوں پر بیٹھے تھیٹر کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ فرہاد تیشے لے کر پہاڑ کاٹنے کی بجائے قلم ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں؛ اور تحصیلِ علم کے فریب میں آکر راہِ عمل سے بھٹک گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ لوگ جنہیں تہذیب و تمدن میں ہمارا ممنونِ احسان ہونا چاہیئے تھا، اپنی سرمایہ داری کے بل پر اپنے گناہوں کا کفارہ یوں ادا کرتے ہیں کہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی کرتے ہیں اور ہماری خوبیوں کو بھی بُرائی بتاتے ہیں۔

جس طرح چین ہندوستان، مصر، ایران، یونان اور عرب تہذیب کے آسمان پر چمکے اور علم کی شعاعوں سے دوسرے ممالک کو منور کیا اسی طرح صنعت و دستکاری میں بھی انہوں نے وہ کمال حاصل کیا جس کا یورپ نہ صرف کل ہی محتاج تھا، بلکہ آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہیگا۔ جی۔ ایف۔ واٹس ( ) تخیلات کا مصور تھا۔ جسے یورپ نے اپنی دنیا کے چند بڑے استادوں میں شمار کیا ہے۔ جب تک زندہ رہا غریب ہونے کے باعث وہ عزت حاصل نہ کر سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ اور وہ لوگ دولتمند ہو گئے جو گھر پر اُس کی تصاویر کی نقلیں کر کر کے بیچا کرتے تھے۔

آرائش و زیبائش کے خط و خال جو مشرق میں نمایاں ہیں یہ دو تین نہیں بلکہ ہزاروں صدیوں کی کوشش و محنت کا نتیجہ ہیں اور اِن کا ایک ایک رنگ اُن کے خطوط کی ایک ایک سیدھ اور ایک ایک ٹیڑھ لاکھوں دماغوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہے اگر متلون مزاج یورپ بچے کی طرح دن میں سو رنگ بدلتا ہے اور ہر بار یہی کہتا ہے ہُرا رہی، ہذا اکبر تو اُسے ایسا ہونے دو لیکن حیرت تو ہے اُن فرزندانِ مشرق پر جو ہر چیز کو انہی کی نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

تاج محل پر اعتراضات ہوئے اور ہوں گے، مگر کب تک جب تک مشرق خستہ حال ہے۔ جب تک اپنی خوبیوں سے آپ بے خبر۔ کچھ عرصہ پہلے کا اعتراض تھا کہ تاج محل اٹلی کے کاریگروں کا بنایا ہوا ہے[1]۔ جس کے معقول جوابات دیے جا چکے اب یہ ناجائز خود دا

---

[1] اٹلی کے کاریگر ہندوستان میں آکر کاریگر بنے ہوں گے۔ وہاں اُن کے کام کا کوئی نمونہ ایسا نہیں ہے ۱۲

مشکی زردہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایئے

دوسرا غمزہ ہے کہ تاج نقائص سے پُر ہے کیا کہنے ہیں آپ کے۔

تاج محل پر اعتراضات اور ہکسلے

مسٹر ہکسلے اچھے ادیب ہوں گے مگر تاج کے متعلق جو اعتراضات انھوں نے کئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب کے زعم میں الفاظ کی مصوری کرتے چلے گئے ہیں اور اس نشے میں اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ اپنی رائے کی آپ ہی تو تردید نہیں کر رہے یا بعض الفاظ ایسے تو استعمال نہیں کر رہے جن کے مطالب و معانی نہ ہوں آگے چل کر ثابت ہو جائیگا کہ اُن کے اکثر فقرے مجذوب کی بڑ کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

آپ فرماتے ہیں۔ کہ "سرو کے تاریک درختوں میں تاج کا سفید رنگ[۵۲] نظر فریب ہے" "اس کی قیمت ضرب المثل ہے" "اس کے نقوش اور قیمتی پتھر دنکا جدید پردۂ شلم بھی مقابلہ نہیں کر سکتا" آگے چلکر لکھتے ہیں "اس کا سنگ مرمر سستی کاریگری کا پردہ پوش ہے" "پوری عمارت ٹھوس سنگ مرمر کی بنی ہوئی نہیں ہے" "سستی کاریگری، قیمت کا ضرب المثل ہونا۔" "چھوٹے سے چھوٹا گلاب بنانے کیلئے بیس پچیس پتھروں کا جوڑا جانا" متضاد فقرے ہیں یا نہیں؟ خیال فرمائیے ٹھوس سنگ مرمر کی عمارت ہونے سے آرٹ میں کیا فرق پڑ سکتا تھا؟ صرف مزدوری اور قیمت کا یہ ہے آپ کی رائے اور واقفیت ہنر فرماتے ہیں حسن عمارت کے لحاظ سے تاج کی بدترین خصوصیت اُس کے مینارے ہیں انسانی ہاتھوں نے کبھی ان چار تیلے کا دُم میناروں سے بدصورت کوئی عمارت تعمیر نہیں کی" جس کا ایک فقرہ "فن عمارت کا لحاظ" کہکے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے آگے آپ فرماتے ہیں:۔

"معمار ان کے متعلق متعدد عذرات پیش کر سکتا ہے مثلاً وہ کہہ سکتا ہے کہ اصل عمارت اور چبوترہ کی وسعت کا خیال کرتے ہوئے ان ضمنی تعمیروں کو اس سے زیادہ وسعت دینا ناممکن تھا۔ یہ صحیح ہے کہ فن عمارت کے نقطۂ نظر سے اس محدود جگہ میں چار نیچی عمارتیں نہایت ضروری تھیں لیکن اُن کو مقابلتاً زیادہ وسیع ہونا چاہیے تھا۔ مگر بدقسمتی سے مذہبی ضروریات نے موجودہ جگہ میں میناروں کی تعمیر ناگزیر کر دی تھی جگہ کم تھی اس لئے میناروں کا اپنی لمبائی کے مقابلہ میں واجب حد تک پتلا ہونا لابد تھا۔ جہاں تک اِن عذرات کی رسائی ہے یہ قابلِ سماعت ہیں۔ مذہبی قوانین کی پابندی میناروں کا وجود چاہتی تھی اور قوانینِ تناسب اس بات کے خواہشمند تھے کہ میناروں کو حیثیت سے زیادہ پتلا ہونا چاہیے۔ لیکن اس کی کیا ضرورت تھی کہ وہ رفتہ رفتہ پتلے ہوتے جائیں؟ اسکی کیا ضرورت تھی کہ ایسے پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو منتخب کیا جائے جن کے کنارے سیاہ تھے، اس کے علاوہ اس کی کیا ضرورت کہ موٹے بھدے برآمدے میناروں کے چاروں طرف نکالدیے جائیں، یہ نکالے بھی گئے تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ ایک دوسرے سے غلط

[۵۲] سنگ مرمر کا رنگ سفید نہیں ہوتا۔ آرٹ کے لحاظ سے اس میں نیلاہٹ اور زردی شامل ہونے سے Grey کہلاتا ہے۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگائیے

فاصلے پر نکالے جاتے؟ خود تاج میں اس قسم کے معائب نہیں جیسے کہ میناروں میں پائے جاتے ہیں"

ان کو غور سے پڑھیئے اور دیکھیئے کہ کس حد تک معقولیت سے کام لیا گیا، میناروں کی مجموعی تعمیری حیثیت پر اس انداز سے بحث کرنا کہ میناروں کو پتلا اور گاؤدم اور چھجوں اور برآمدوں کو بھدا بتایا جائے یہ ظاہر کرتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں حالانکہ ان دونوں کو ملا کر دیکھنا چاہیئے۔ کہ تناسب کی خصوصیات اسی طرح واضح ہو سکتی ہیں۔

مذہبی ضرورت کا ذکر کر کے مسٹر بکسلے نے کوکے اپنی ناواقفیت کا انتہائی ثبوت دیا ہے، ان کی خبر نہیں کہ مشرقی حرفت اور خاص کر مغلوں کی صنعت آرائش۔ کے عناصر (Decoration کے elements) کیا ہیں مغلوں کو تناسب کا اس قدر خیال تھا کہ اسی تاج کے دونوں طرف مسجدیں بنائی ہیں۔ حالانکہ مذہباً مسجد کا رُخ قبلہ کی طرف ہونا ضروری ہے لیکن انھوں نے مقابلہ کی خوبصورتی قایم رکھنے کے لئے ایک مسجد کا رخ ہی دوسری جانب کر دیا۔

مثل سید ہے۔ یکساں۔ بغیر چھجّے اور برآمدے کے بھی مینار بنانا جانتے تھے اور انہوں نے بنائے۔ مگر وہیں جہاں موزوں تھے۔ جہاں آپکے خیال کے مطابق چبوتروں کی وسعت زیادہ تھی۔ جہاں اتنا اونچا گنبد درمیان میں نہ تھا۔ لاہور کی مسجد وزیر خاں دیکھیئے اُس کے مینار اوپر نیچے سے برابر ہیں۔ مگر گول نہیں بلکہ پہلو دار ہیں گنبد بھی بلند نہیں۔ مینار بھی چار دیواری میں سے اُٹھائے گئے ہیں۔ شاہدرہ میں جہانگیر کا مقبرہ ہے اُس کے چاروں مینار بھی ایسے ہی ہیں لیکن چونکہ تاج کی عمارت میں سب سے زیادہ نمایاں چیز اس کا درمیانی گنبد ہے اس لئے اسکے لحاظ سے میناروں کو گاؤدم ہونا چاہیئے تھا۔ فن تعمیر میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔

(۱) ضرورت	(۳) روشنی	(۵) صفائی	(۷) پختگی
(۲) مقام	(۴) ہوا	(۶) خرچ	(۸) خوشنمائی

پہلی سات باتوں میں بحث کرنا نہیں چاہتا کیونکہ آپ کے تمام اعتراضات دراصل تاج کی خوبصورتی اور دیدہ زیبی پر ہیں اور اسی لحاظ سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

حسن کا تعلق وجدان صحیح اور مذاق سلیم سے ہے۔ کیونکہ حسن کی ایسی مکمل وجامع تعریف آجتک نہیں ہو سکتی۔ جس پر سب متفق الرائے ہوں ان حدود میں رہنے کے بعد بھی جنہیں اکثر استاد مصوّروں، سنگتراشوں اور فلاسفروں نے معیّن کیا ہے، اگر کچھ بنایا جائے تو بھی تکمیل حسن یقینی نہیں اور ضروری نہیں کہ تمام دیدہ ور اسپر اتفاق رائے کرلیں کہ وہ لائق ستائش ہے اس وجہ سے حسن کی سند صرف اُس کا مقبول عام وخاص اور شہرۂ آفاق ہونا ہی ہے۔ یوروپ کا دعویٰ ہے کہ نیچر خوبصورت ہے اور ہر چیز نیچرل ہونی چاہیئے یہ صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے آگے چلکر ثابت کیا جائیگا کہ وہ جسے ناپسند کرتے ہیں وہ بھی نیچر سے باہر نہیں۔ سوال صرف یہ باقی رہجاتا ہے کہ ایک عمارت کو تمام تعمیری خوبیاں قایم رکھتے ہوئے کہاں تک خوبصورت بنایا جاتا ہے اور آیا آرٹ کے لحاظ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر کی دوکان مقبول عام ہے

سے تاج محل خوبصورت یا بہترین عمارت ہے یا نہیں آرٹ کے حسن میں حسب ذیل عناصر ضروری ہیں:-

(۱) ڈیل ڈول (قامت) (۲) تناسب (۳) رنگت (۴) جدت (۵) مقابلہ واختلاف (۶) خط وخال کی روانی وتیزی (۷) نزاکت (۸) نفاست وصفائی (۹) کیفیت

اور انہیں کے لحاظ سے ایک عمارت کے حسن وقبح پر بھی حکم لگایا جاسکتا ہے۔ خوبصورتی کے متذکرہ بالا تمام عناصر کو سمجھنے کیلئے مثالوں کی ضرورت ہے، چونکہ انسان فطرت کا مکمل ترین کرشمہ سمجھا جاتا ہے اس لئے اسی کی مثال پیش کرتا ہوں۔ انسان میں ڈیل ڈول سے مراد اُسکا سڈول بدن اور قد ہے نہ بہت دبلا۔ نہ موٹا۔ نہ بھدا۔ تناسب سے مراد موزونیت ومناسبت اعضا ہے۔ تناسب میں مقابلہ واختلاف بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کی پنڈلی سڈول اور مچھلی کی طرح خوبصورت ہے مقابلہ کے لئے اُس کی دوسری پنڈلی موجود ہے۔ اختلاف کے واسطے رانیں ہیں۔ پاؤں ہیں۔

انسان میں جدت۔ لباس۔ گفتگو۔ حرکت۔ رنگت وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جدت میں بھی مقابلہ واختلاف اور تناسب ہونا ضرور ہے مقابلہ واختلاف میں بھی تناسب ضروری ہے۔ مثلاً۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ کہ کسی کی پنڈلی ران سے دوگنی ہو۔ اور پھر بھی خوشنما ہو۔ علی ہذالقیاس ہر عنصر میں تمام باقی عناصر بھی ضروری طور پر شامل ہوتے ہیں جنھیں مذاق سلیم رکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔ تو ان کی تحلیل نہ کرسکے کم فہم نقاد ایک چیز کو بُرا اس لئے کہہ دیتے ہیں کہ وہ دل میں نکتہ چینی کی ہوس رکھتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اُسے اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے حسن کے لئے بھی سمجھ درکار ہے۔ ہر حسن میں دور ونزدیک دونوں قسم کی خوبصورتی کا ہونا لازمی ہے۔ مثلاً کسی کے آغوش میں جاکر آپ اُس کے قد کی خوبصورتی کو نہیں دیکھ سکتے جسے شاعری کی زبان میں چھب کہتے ہیں۔

مجھے مسٹر ہکسلے کے اعتراضات پڑھکر یقین ہوگیا ہے کہ انھوں نے تاج محل کی تعمیر کو دور سے نہیں دیکھا کہ وہ تناسب کا صحیح اندازہ کرسکتے۔ ٹونڈلہ سے جو سڑک آگرہ کو جاتی ہے اگر معترض اُس پر کھڑے ہو کر دو تین میل کے فاصلہ سے تاج محل کو دیکھتا ——— تو تناسب پر کوئی اعتراض نہ کرسکتا۔ نہ مینار لمبے اور گاؤدم نظر آتے نہ زاویے اور کونے وغیرہ بُرے دکھائی دیتے میں دعوی سے کہہ سکتا ہوں کہ خوبصورتی کا یہ پہلا جزو سب قوموں سے زیادہ مغلوں کے زیر نظر تھا۔

اُن کے تناسب میں جدت۔ مقابلہ واختلاف۔ خطوط کی روانی وتیزی۔ نزاکت۔ نفاست وصفائی۔ کیفیت وغیرہ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ رومن ہندو۔ گاتھک وغیرہ طرز تعمیر میں یہ تمام خوبیاں اس قدر مناسبت کے ساتھ موجود نہیں ہیں رومن طرز تعمیر میں یکسانیت ہے گاتھک اور ہندو طرز تعمیر کے تناسب میں خطوں کی تیزی۔ مقابلہ واختلاف۔ نزاکت۔ نفاست وصفائی وغیرہ کے بہت سے نقائص موجود ہیں۔ مغلوں کی تعمیر میں گنبد۔ دروازوں کی گولائیاں۔ میناروں کا حسب موقع گاؤدم ہونا۔ نہریں۔ چبوترے۔ حقیقتاً عمارت کے سینہ ہے اور عمودی خطوط کا جواب ہوا کرتے ہیں۔ جو کسی اور قوم کے طرز تعمیر میں نظر نہیں آتا۔ ایک اور بڑی خوبی جو مغلوں کے

تمباکو خوردنی اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

کام میں بالخصوص تاج وغیرہ میں ہے وہ یہ ہے کہ شمال مشرق جنوب مغرب جس طرف سے بھی دیکھا جائے توجہ جذب کر لیتا ہے صنعت کی رو سے آرٹ کا پہلا جزو Composition ہے جس کو میں اوپر سمجھا آیا ہوں۔

کمپوزیشن پر یوروپ میں کوئی کتاب شایع نہیں ہوئی۔ صرف بعض استادوں کے لیکچر ہیں جن میں دراصل اپنے کام کرنے کے طریقے بتائے ہیں اور چند اصول فرض کر لئے ہیں جن کو دوسرے استاد الگ رکھ کے بھی اپنے فن کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں اور کامل و ماہر فن شمار ہوتا ہے جو ان مفروضہ اصولوں سے بے نیاز رہ کر اچھی تصویر۔ بُت یا عمارت کا نقشہ بنا کر پیش کر سکے۔ اور مقبول عام ہو جائے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ Sir joha Raynold نے رائل اکیڈمی میں لیکچر دیتے ہوئے بتایا۔ کہ نیلا رنگ تصویر کے پیش foreground اور پردہ (Drapery) میں استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ رنگ دوری ظاہر کرتا ہے۔ اور کسی چیز کو آگے بڑھا کر دکھانے سے قاصر ہے۔ اس لئے صرف پُشت (Back ground) میں استعمال ہونا چاہیئے

جو اس کا حریف مقابل تھا اور اُس کی طرح رائیل اکیڈمی کا پریزیڈنٹ نہ بن سکا تھا۔ اُس نے چند روز بعد ایک تصویر نمائش میں بھیجی جو ایک نوعمر لڑکے کی تھی جس میں نیلے رنگ کے کپڑے بنائے گئے تھے اور پشت (Back ground) سے بالکل علیحدہ نظر آ رہے تھے۔ دیکھیئے ایک استاد کے آگے ایک عام اصول نے کس طرح دم توڑ دیا۔ تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ برطانیہ نے یہی تصویر جس کا نام Blue Boy تھا امریکہ کے ہاتھ ہزاروں پونڈ کو فروخت کی۔

یوروپ نے عام طور پر اس کا اقرار کیا ہے گو دبی زبان سے کہ چین۔ جاپان۔ ہندوستان۔ ایران اور مصر کی ترکیب (کمپوزیشن) اور صنعتی آرائش (Conventional Decoration) تک پہنچنا دشوار ہی نہیں۔ بلکہ شاید صدیوں کی مہارت کے بعد بھی آسان ثابت نہ ہو۔

"Allies in Art" جو حال ہی میں فرانس و برطانیہ نے متفقہ طور پر شایع کی اُس میں K. Ishikashi ایک جاپانی مصوّر کی تصویر Sea Breeze بھی شایع کی ہے اور اُس پر یہ رائے ظاہر کی ہے "ہم آہنگی، رنگ اور ترکیب میں مغربی نقاش اس کے مثل دوسرا نقش پیش نہیں کر سکتا"

مسٹر ہکسلے نے میناروں پر جو اعتراض کیا ہے۔ کہ اُن کے چھجوں کا درمیانی فاصلہ کم و بیش ہے وہ تناسب میں مقابلہ و اختلاف رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ جو چاروں میناروں میں یکساں ہے بعض لوگ دیوار کے بیرونی نقش و نگار کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کمپوزیشن اور تناسب کو تباہ کر دیتا ہے اور عمارت کی نزاکت وقار اور صفائی کو غارت کر کے یکسانیت Monotony پیدا کر دیتا ہے۔

خیر یوروپ کو جانے دیجئے کہ وہاں دھوئیں سے عمارتیں غارت ہو جاتی ہیں، خود ہندوستان میں بھی وہ عمارتیں گرد و غبار سے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

صاف نہیں رہ سکتیں جن میں بیرونی جانب نقش ونگار زیادہ ہوتا ہے مغلوں نے بیرونی حصوں کو سادہ رکھا ہے زیادہ کام اندر پیوستہ پتھروں سے کیا ہے۔ تاکہ صفائی میں کوئی فرق نہ آئے یہی وجہ ہے کہ آج اس کس مپرسی کی حالت میں بھی اُن کی عمارتیں دُھلی دھلائی نظر آتی ہیں۔ کمپوزیشن کی خوبی یہی ہے کہ اس کی سادگی جاذب توجہ ہو۔

نظر فریبی

آپ ایک پہاڑی نظارے کو دیکھتے ہیں جہاں رنگین بادلوں سے چھن چھن کر ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں مختلف رنگ پیدا کر رہی ہیں یہ نظارہ اگر رنگوں اور خطوں کا درست تناسب رکھتا ہے تو آپ کو متوجہ کرنے کے لئے کافی ہے یہ اس کی کمپوزیشن ہے آپ ادہر کا رُخ کرتے ہیں اور ان پہاڑوں تک پہنچتے ہیں وہاں اگر نشیب و فراز میں میوہ دار اشجار نہیں ہیں اگر وادیوں میں قدرتی پھولوں کے کھیت۔ آبشاروں اور جوئباروں کے نغمے نہیں ہیں تو آپ کے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی اور آپ کی مسرت ختم ہو جاتی ہے اگر نظر فریبی سے یہی مقصود ہے کہ صرف دور سے ایک چیز اچھی معلوم ہو اور قریب سے اس کی دلکشی زایل ہو جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ تاج میں ہرگز یہ بات نہیں ہے کیونکہ قریب آنے پر اس کی باریکیاں اور خط و خال حد درجہ دلکش اور دلچسپ ثابت ہوتے ہیں۔

اٹلی کے مشہور و معروف گرجاؤں یا یورپ کی بڑی بڑی عمارتوں کو دیکھئے گا تو معلوم ہوگا کہ ان کی دیواریں دستی تصاویر سے بھری پڑی ہیں مگر کیا وہ معمار کی خوبی میں شمار ہوں گی یا عمارت کی خوبصورتی میں فن عمارت اُن پر فخر نہیں کر سکتا۔ کھڑکیوں میں رنگین شیشوں کو جوڑ کر تصاویر بنائی ہیں۔ فرش پر قالین بچھے ہیں کوچ پڑے ہیں قیمتی پردے دروازوں پر لٹکتے ہیں مگر یہ باتیں فن تعمیر کی خوبی میں تو داخل نہیں ہو سکتیں۔

آرٹ کا دوسرا حصہ آرائش ہے جس کے متعلق میں مثال دیکر لکھ آیا ہوں کہ پہاڑوں کے پھل پھول آبشاریں وغیرہ اور انسان میں خط و خال اور لباس یہ زیبائشی اجزا ہیں۔ آرائش ہر وقت بناوٹ یا تصنع کی محتاج ہے اس لئے تصنع آرٹ کا لازمی جز ہو جاتا ہے مثلاً آپ چاہتے ہیں آپ کی بیوی کے کرتے پر پھول ہوں یہ خیال آپکے دل میں قدرتی خوبصورت پھول دیکھنے سے پیدا ہوا۔ اُدہر کپڑا بننے والا اپنی مشینوں اور فن کی مجبوریوں کی وجہ سے بالکل قدرتی پھولوں سے جیسے ہموار سطح پر نہیں بنا سکتا بعض اوقات آپ بھی چاہتے ہیں کہیں جھاڑی والا پھول بیل کی طرح چل جائے۔ کہیں بیل والے پھولوں کا گلدستہ بن جائے۔ لہٰذا آرائش کے لئے تصنع لازمی ہے۔

تاج میں آرائش تصنع

مغل عمارات اس لحاظ سے بھی اس قدر مکمل ہیں کہ ان کے کسی حصے میں دنیا کا کوئی کاریگر نقص نہیں نکال سکتا۔ بالخصوص تاج کی آرائش

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

تفصیل تو استادوں کے لئے رہبر کا کام دیتی ہے۔ البتہ یہ یقینی ہے کہ مغلوں نے انسانی تمثالوں پر پھول پتیوں کو ترجیح دیتی ہے اور آرائش کا موضوع نیچر کے اس خاموش مگر حد درجہ نمایاں پہلو کو قرار دیا ہے۔

مسٹر ہکسلے کا اعتراض یہ بھی ہے کہ تاج میں جدت نہیں اور تخیل کا فقدان ہے۔ یہ عمارت کلاسک نہیں وغیرہ وغیرہ۔ تاج کا کلاسک نہ ہونا اور تخیل کا فقدان میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے اس میں صرف ادب ہی ادب ہو اور یہ ظاہر ہے کہ انجینیروں کا تخیل شاعروں کے تخیل سے ذرا مختلف ہوتا ہے بہرحال میرے نزدیک تاج کی عمارت خود اس مہمل فقرے کا بامعنی جواب ہے۔ البتہ جدت کے متعلق اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شاید تاج کی بیشمار تصاویر جو ہزار ہا رسالوں میں شایع ہو چکی ہیں اور چھوٹے چھوٹے مجسمے جو ہر جگہ بکتے ہیں مسٹر ہکسلے نے دیکھے ہوں گے اور اسی لئے شاید انہیں تاج کا نمونہ کچھ نیا معلوم نہ ہوا ہوگا۔ اگر جدت کا اعتراض اس کے Details پر کیا گیا ہے (کیونکہ مغلوں کی عمارات کے اکثر حصے اور بیل بوٹے دنیا بھر میں رواج پا چکے ہیں) اور اس سے مقصود یہ ہے کہ نقش و نگار کا نمونہ ایک دوسرے سے مختلف ہو سو اس کے لئے فتحپور سیکری کا وہ محل دیکھ لیں جس میں ایک ہی چھت کے نیچے چالیس مختلف بے نظیر نمونوں کے ستون موجود ہیں۔ اکبری معمار شاید یہ کھیل یوروپ کے کم فہم نکتہ چینوں کی زبان بندی کے لئے کھیل گئے تھے۔ ورنہ یہ عمل آرٹ نہیں ہے اور نہ اسے مغلوں نے اصول تعمیر بنایا۔

مسٹر ہکسلے لکھتے ہیں "تاج کے دروازے کے پھول نہایت خراب ہیں نہ وہ رسمی کہلائے جانے کے مستحق ہیں نہ اصل زندگی کے مطابق" معلوم نہیں اصلی زندگی کے مطابق ہونے سے کیا مراد ہے۔ کیا فن عمارت کی رو سے وہاں ایک چھجہ چاہیے تھا جس پر قدرتی پھولوں کے گملے ہوتے۔ میرے خیال میں قدرتی پھول اتنے بڑے نہ مل سکتے جو ایسی عالیشان عمارت کے دروازہ پر اتنے اونچے موزوں معلوم ہوتے اب رہ گیا ان کا رسمی ہونا سو اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور یہ اعتراض بالکل لغو ہے۔

عبدالرحمن اعجاز

رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع اگر بیس تاریخ تک نہ دی گئی تو رسالہ مفت روانہ نہ کیا جائیگا۔ قیمت بھیجیے یا وی۔ پی منگایئے۔

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری اپنا پتہ اور نام صاف صاف تحریر فرمایئے ورنہ جواب نہ دیا جائیگا۔

جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے

منیجر

احبابوں سے کہیئے کہ عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیں

شاعر اور تتلی

شاعر:-

کرشمہ یوں تو ہے ادنیٰ سا تو قدرت کی صنعت کا — مگر ہر صنعتِ قدرت کا جلوہ تجھ میں پنہاں ہے
ہے آب و رنگ گوناگوں ترا زینت دہِ گلشن — اگر چاہوں تو کہہ سکتا ہوں تو خود ہی گلستاں ہے
تو انوارِ شعاعِ مہرِ تاباں کا ہے شیرازہ — تری پرواز گویا اک طرح تحلیلِ الواں ہے
تری رنگینیاں ہیں باعثِ صد آرزو دل میں — ترا اندازِ بیتابی مرا شوقِ فراواں ہے
مجسم تجھ میں ہیں نقاشیاں بہزاد و مانی کی — حضورِ گل تپاں یا تو کسی بلبل کا ارماں ہے
ترا رعشہ ہے یا لرزش ہے موجِ مے کی مینا میں — تری پرواز ہے یا اضطرابِ برقِ خنداں ہے
سنوں میں بھی تو آخر راز کیا ہے تیری ہستی کا — مثالِ نکہتِ گل باغ میں تو کیوں پریشاں ہے

ہے کس کی جستجو باعث تری اس بیقراری کا — کہ پیہم تو تک و دو صورتِ دیوانہ رکھتی ہے
تجھے چاکِ قبائے گل نے کر رکھا ہے آوارہ — کہ بوئے گل تجھے ہر وقت یوں مستانہ رکھتی ہے
مگر تو کچھ بھی ہو فقدانِ ہمت تجھ سے ظاہر ہے — کہ اپنے کو جلالِ شمع سے بیگانہ رکھتی ہے
نہ ڈر صیاد کا تجھ کو نہ کھٹکا دستِ گلچیں کا — ق — تو پھر ہر گل سے جب یوں ربطِ بیباکانہ رکھتی ہے
کہوں کیسے کہ بلبل کی طرح تو اپنی ہستی میں — نہفتہ سوز و سازِ عشق کا افسانہ رکھتی ہے

تتلی:-

میں رازِ عشق بلبل کی طرح افشا نہیں کرتی — بیاں جو ہو نہیں سکتا میں وہ افسانہ رکھتی ہوں
مجھے کیا خوف گلچیں کا، مجھے صیاد کا ڈر کیا — نہ میں کاشانہ رکھتی ہوں نہ شوقِ دانہ رکھتی ہوں
جدا پروانہ سے ہے کیش میرا ضبطِ الفت میں — میں اپنے دل میں ضبطِ جوشِ صد پروانہ رکھتی ہوں
مری رنگینیاں شرمائیں آخر کیوں نہ گلشن کو — کہ اپنے عشق میں صد جلوۂ جانانہ رکھتی ہوں
حقیقت کا تجسس ہوں پریشاں ہوں تو رہنے دو — میں ہوں دیوانہ لیکن ہوش صد فرزانہ رکھتی ہوں

○ کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر کی ایک شاخ چاندنی چوک دہلی میں ہے

اگر تو چاہتا ہے راز ہستی جاننا میرا — تو پہلے بیقراری سیکھ اور آتش بداماں ہو
مثالِ طور یعنی تو بھی جل کر خاک ہو جائے — اگر مایل کبھی تجھ پر نگاہِ برق ساماں ہو
اگر ہے اشتیاقِ دیدِ جاناں موجزن دل میں — تو لازم ہے کہ پہلے صورتِ آئینہ حیراں ہو
یہ انوارِ شعاعِ مہرِ عالم جس کے مظہر ہیں — اگر چشمِ حقیقت ہو تو وہ ہر جا نمایاں ہو
اسی کے جلوۂ رنگیں سے ہر ذرہ درخشاں ہے — وہ آبادی ہو، ویرانہ ہو، یا صحنِ گلستاں ہو

چو خواہی درکِ حسنش شورشِ نظارہ کن پیدا
بہ شوقِ جستجو یعنی ز دل فوارہ کن پیدا

شہاب برنی

ایک گمِ گشتہ کی یاد میں

محبت اپنی غیروں کیلئے راحت رساں کر دی — یہ دولت میرے حصہ کی نصیبِ دشمناں کر دی
کہانی جو خلوصِ عشق کی تھی دید کے قابل، — مجھے تڑپا کے یوں شرمندۂ ضبطِ بیاں کر دی
تری بے اعتنائی ستزدہ ہونیکو کیا کم تھی — کہ دروازے پر اپنے اور قبہ پاسباں کر دی
خدا سے لو لگا دینے کی یہ ترکیب تنہا تھی؟ — نگہ میری ہٹا کر خود سے سوئے آسماں کر دی
محبت کی نگاہوں نے بدل کر آنِ واحد میں — حقیقت رشتۂ باطل کی دنیا کو عیاں کر دی
عقیدت کیش دل کو توڑ ڈالا غیر کی خاطر — نثارِ عشق کی زحمت شعاری رائگاں کر دی
شکستہ خاطری میں بڑھ گئی جینے سے بیزاری — جفا نے زندگی میری وبالِ دوش و جاں کر دی
ترے چھٹنے نے اے سفاک مٹی میں ملا ڈالا — کدورت نے تری برباد خاکِ آشیاں کر دی
گلستانِ تمنا کو اجاڑا دستِ غفلت نے — بہارِ عمرِ دو روزہ مری نذرِ خزاں کر دی
خبر ہے اے ستمگر کیا کیا تیرے تغافل نے — مری تسکین مجھ سے چھین کر وقفِ فغاں کر دی
حسامِ زار سے یہ دشمنی تھی یا محبت تھی، — وفا آموختی از ما بکارِ دیگراں کر دی

ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کر دی

حسام الدین کاکوروی

مشکی زردہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایے

سیاحتِ ماہتاب

ہم میں بہت نہیں تو کم از کم کافی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے کرۂ ارض کا چکر لگایا ہے اور اس طرح تقریباً پچیس ہزار میل میل کی مسافت طے کی ہے کیا ہم لوگ کبھی اس قابل ہو سکیں گے کہ اپنی دنیا سے چاند تک سفر کر سکیں یعنی بحرِ خلا کے تقریباً دو لاکھ انتالیس ہزار میل کے فاصلہ کو عبور کر لیں ؟

درحقیقت آج ہم ایسا سفر کرنے کے ناقابل ہیں، لیکن یہ ناممکن نہیں ہے کہ مستقبل میں ہم کسی دن زمین سے چاند تک جا سکیں اور پھر واپس آجائیں کوئی شخص جو عصرِ حاضر کی سائنس اور ایجادات کی ترقی رفتار سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے اس امر سے انکار نہ کریگا کہ مستقبل میں ایسا سفر ناممکن نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ کل ہی کوئی ایسے وقیع اور زبردست دریافت ہو جائے جو دنیائے ہوابازی میں انقلاب پیدا کر دے اور اگر ایسا ہوا تو دنیا بھر کے بڑے بڑے موجدوں اور سائنسدانوں کی تمامتر توجہات فوراً سیاحت ماہتاب کے مسئلہ کی پیچیدگیوں کو حل کرنے میں مصروف ہو جائیں گی۔

لیکن اہم اور وقیع دریافتوں کے باوجود زمین سے چاند تک سفر کرنے کے لئے راستہ میں بڑی دقتیں حائل ہونگی۔ پہلی دقت جس کا ہمیں سامنا کرنا پڑیگا وہ قوت ہے جو سطح ارض سے ہمارا رشتہ قایم کرتی ہے یہ قوت جسے ہم کشش مرکزی کہتے ہیں ہمیں مرکز زمین کی جانب چاند سے دور کھینچتی ہے اور اس وقت تک یہ قوت اتنی زبردست ہے کہ ہم کو کوئی ایسا ذریعہ معلوم نہیں جس سے اُسکے اثر کو زائل کیا جا سکے۔

اس کشش مرکزی کی رو سے بچنے اور سطح ارض سے اوپر اُڑنے کے لئے کم از کم ۳۶ ہزار فٹ فی سکنڈ کی رفتار لازمی ہوگی، چونکہ زمانہ حال کی بہترین توپیں بھی تقریباً تین ہزار فیٹ فی سکنڈ کی رفتار سے گولہ پھینک سکتی ہیں اس لئے صاف ظاہر ہے کہ سطح ماہتاب تک پہنچنے کے لئے سطح زمین سے اوپر اُڑتے وقت اس سے بارہ گنی تیز رفتار اختیار کرنا پڑیگی۔

مزید برآں، چونکہ زمین اور چاند دونوں گردش میں ہیں اس لئے منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لئے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے ریاضوی حسابات لگانے ہونگے ورنہ اگر ہمارا ہوائی جہاز سطح ماہتاب سے پرے ہٹ گیا تو اس وقت تک جبکہ کوئی سیارہ مثلاً مشتری ہمیں اپنی گرفت میں نہ لے ہمیں ایک نامعلوم عرصہ تک بحرِ خلا میں تیرنا پڑیگا۔

علاوہ ازیں چاند تک سفر کرنے کے راستہ میں اور دوسرے خطرات رونما ہوں گے۔ ایسا سفر کرنے کیلئے ایک مضبوط، نہایت

عمدہ عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایئے

ہی مضبوط آلۂ پرواز بنانا ہوگا۔ قطع نظر اس رگڑ اور دباؤ کے جو کرۂ ہوائی میں اتنی تیز رفتاری سے پرواز کرنے کے باعث ہوگا۔ جب ہم ایک محدود فاصلہ طے کرنے کے بعد ایتھر کے گردو پیش میں محصور ہو جائیں گے تو ایک زبردست خارجی دباؤ پڑیگا۔

بقائے حیات کے لئے ہمیں اپنے آلۂ پرواز کے اندر عملی طور پر انہیں حالات میں رہنا پڑیگا جن میں کہ ہم جہاز پر بیٹھنے سے پہلے سطح ارض پر تھے ہمیں سانس لینا ہوگی اور اپنے اجسام پر تقریباً وہی ہوائی دباؤ رکھنا پڑیگا جو سطح پر تھا اس لئے جب تک کہ کوئی ناقابل پیش گوئی دریافت نہ ہو۔ آلۂ پرواز کی دیواریں اتنی زیادہ مضبوط بنانا پڑیں گی کہ ایتھر میں باہر پھیلنے سے باز رہ سکیں۔ ورنہ کسی جگہ جہاز کے پھٹ جانے سے ہملوگ اچانک یا آہستہ آہستہ تباہ ہو جائیں گے۔

ہمارے آلۂ پرواز کی دیواریں اتنی زیادہ مضبوط بنانا پڑیں گی کہ دمدار ستاروں اور ٹوٹنے والے تاروں (Shooting Stars) سے تصادم ہوتے وقت ٹوٹ نہ جائیں۔ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اجرام فلکی کرۂ ارض سے تھوڑے فاصلہ پر اسے ۴۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہے ہیں اور ہمارا جہاز بھی ۷ یا ۷ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے پرواز کریگا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ تصادم کوئی کم زبردست نہ ہوگا۔

جب ہمارا آلۂ پرواز چاند تک پہنچ جائیگا تو اس کا اترنا کچھ آسان بات نہ ہوگی کیونکہ چاند میں کوئی معلوم شدہ کرۂ ہوائی موجود نہیں ہے جو ہماری رفتار میں مزاحم ہو اور یقین کیا جاتا ہے کہ سطح ماہتاب بالکل سخت اور پتھریلی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر ہم اپنے آلۂ پرواز کو کشش ارضی کی زبردست گرفت سے آزاد کر سکتے تو ہم آج ہی ایک ایسا آلۂ پرواز بنا لیتے جو ایتھر سے گزر کر ہمیں زمین سے چاند تک لے جاتا بلاشبہ اتنا مضبوط جہاز بنایا جا سکتا تھا کہ دباؤ کے خطرناک حملوں اور اجرام فلکی کے تباہ کن تصادم کو بخیر برداشت کر لیتا اور ختم مسافت کی اچانک اور خوفناک ٹھیس سے محفوظ رہتا۔ حالانکہ ایسے عدیم الوجود آلۂ پرواز کی تعمیر ایک نہایت اہم اور مشکل امر ہے تاہم ہمارے بیسویں صدی کے ماہرین فلکیات ایسا جہاز بنانے میں مدد دے سکتے تھے جو منزل مقصود تک پہنچ جاتا اور ممکن ہے کہ یہ جہاز اتنا مکمل ہو جاتا کہ ہمارے ہوابازوں کو زیادہ دقت نہ اٹھانی پڑتی۔

لیکن ایک ایسے آلۂ پرواز کو چلانے کے لئے جو غالباً دس ٹن یا اس سے زیادہ وزنی ہوگا اور قریباً سات میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سطح ارض سے اوپر اڑیگا اور ایتھر سے گذرے گا، جتنی قوت درکار ہوگی اس کا تصور ہی کچھ کم خوفناک نہیں ہے۔ اتنی قوت کا استعمال فی الحال بادی النظر میں ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن مستقبل ایجادیں اور دریافتیں ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہیں۔

کم از کم اندازاً ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ اس امر کی تکمیل میں کتنا عرصہ لگے گا۔ چاند کی قوت کشش کے باعث رفتار میں جو مزید تیزی ہو جائیگی اگر اس کو قطعاً نظر انداز کر دیا جائے تو اوسط وقت ۹ ½ گھنٹہ ہوگا۔ یا بالالفاظ دیگر ہم اپنی دنیا کے کسی شہر میں ۸ بجے جہاز پر سوار ہو سکیں گے اور دوسرے دن چھ بجے صبح سے قبل سطح ماہتاب پر اتر سکیں گے۔

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا تار کا پتہ صرف "خدا" کافی ہے

لیکن اب ایک اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم چاند تک پہنچ جائیں گے تو واپس کیونکر آئیں گے؟ اس سوال کا جواب دینا ابھی بہت مشکل ہے۔ اگرچہ ضروری مشین کی موجودگی میں، جو ہمارے آلہ پرواز کو آگے ڈھکیل سکے چاند تک جانیکی بہ نسبت زمین تک آنا آسان ہوگا۔

زمین کی بہ نسبت چاند کی جسامت کم ہونیکی وجہ سے سطح ماہتاب کی کشش مرکزی ہماری دنیا کی کشش مرکزی کا ۱/۶ حصہ ہے اسلئے اُس کا اثر زائل کرنے کے لئے صرف چھ ہزار فیٹ فی سیکنڈ سے کچھ ہی زیادہ رفتار کی ضرورت ہوگی تاہم واپسی کا سفر طویل ہوگا اور اُس میں قریب قریب ۵۶ گھنٹے صرف ہوں گے اس طرح خاندان تک جانے اور واپس آنے میں اگر کوئی دیر واقع نہ ہوجائے اور کوئی خاص آفتِ سماوی کسی خاص صورت میں اثر پذیر ہو کر مانع و مخل ہو جو ایک زبردست تباہی کا خوف دلاتی ہے تو صرف تین یوم صرف ہوں گے۔

خدا کرے اہلِ سائنس اور ماہرانِ فن کی مساعی اس عقدۂ لاینحل کا حل تلاش کرلینے میں کامیاب ہوں اور جلد کوئی ایسی جدید انکشاف معرض ظہور میں آئے کہ جس سے کرۂ خاک کے باشندے مہتاب (؟) — معرض ظہور میں آئے کہ جس سے کرۂ مادیں کوئی حیرت خیز آلۂ پرواز سوئے ماہتاب سرگرم پرواز دکھائی دے۔

جگیشور ناتھ ورما بیتاب

---

۴ کتابیں

الفاروق مکمل ہر دو حصہ مع نقشہ دنیائے اسلام علامہ شبلی کی سیرت حضرت عمرؓ پر مشہور کتاب ہے عہ
ابو مسلم خراسانی جرجی زیدان مصری کے مشہور ناول کا اردو ترجمہ عہ
نقش ارژنگ جلال الدین صاحب اکبر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ عہ
خطوطِ شبلی عطیہ بیگم فیضی اور زہرا بیگم فیضی کے نام قیمت عہ

مینجر نگار بھوپال

آرزوئے معصوم

میں کاش گلِ گلاب ہوتا اک کیف پہ مرا شباب ہوتا
جھونکے مرا پالنا ہلاتے بھونرے مجھے لوریاں سناتے
رنگت سے مرے چمن چمکتا نکہت سے مرے جہاں مہکتا
خوشبو کی عنبر بیزیوں میں بلبل کی ترانہ ریزیوں میں
غم سے کوئی واسطہ نہ ہوتا!
قسمت کا مجھے گلہ نہ ہوتا!

یا ربِ ڈل جیسا رہوتا! سرشارِ ئے بہار ہوتا!
رخشاں مری شاخ شاخ رہتی رگ رگ میں مے حیات رہتی
آئینۂ آب دیکھتا میں! ہر سمت شراب دیکھتا میں!
بگلے مری ٹھیٹوں میں سوتے شب باش کلنگ آکے ہوتے
حسرت سے دل آشنا نہ ہوتا
قسمت کا مجھے گلہ نہ ہوتا

یا دامنِ کوہ پر شجر میں کشمیر کے آہوؤں کے گھر میں
اک چشمۂ آبِ سرد ہوتا رگ رگ کے جو رہنورد ہوتا
میں شوق وصال میں اچھلتا سبزے سے لپٹ لپٹ کے چلتا
اور دیکھ کے وجد بید مجنوں گاتا میں ترانۂ ذاتِ بیچوں
دلمیں کوئی وسوسہ نہ ہوتا
قسمت کا مجھے گلا نہ ہوتا

احساس میں رنج و غم ہے مضمر جذبات میں برق قلب مضطر
ادراک میں آفت نہاں ہیں اور اصلِ شعور بجلیاں ہیں

مخمور

اصغر علی محمد علی تاجر عطر سے ہر قسم کا عطر منگائیے

تخئیل ہی سر بسر تمنا — خود عقل ہے آدمی کی بپتا
ارماں ہیں تفکرات کی ماں — کانٹوں میں الجھ رہا ہے انساں
میں کاش بشر بنا نہ ہوتا!
قسمت کا مجھے گلہ نہ ہوتا!

امین حزیں

موجِ تسنیم

آزادہ روی میں وقت کٹے کچھ فکر و غم ایام نہو، — اب ایسی جگہ چل کر رہیے جہاں قید صبح و شام نہو
جب عشق سے دلکو ہٹا دیکھوں سرتا سر اپنی فنا دیکھوں — گر جلوۂ یار جگا دیکھوں ڈرتا ہوں کہ سر انجام نہو
رکھا نہ جراحت پر پھاہا تو ہی نے کبھی در نہ شاہا — بیمار الم نے کب چاہا یہ غم نہ مٹے آرام نہ ہو
مایل یہ کذب پرستی پر نازاں یہ جا بیکدستی پر — اللہ بساطِ ہستی پر انساں ہو مگر خود کام نہ ہو
یہ قید مجھے کس نے بخشی کیا سوچ کے بیں نے گوارا کی — آغاز ہے یہ اُس قصہ کا مر کر بھی کبھی جو تمام نہ ہو
چند اک سرگرم دوا دیکھے چند اک مصروف دعا دیکھے — چند اس حسرت میں فنا دیکھے کچھ بھی ہو مگر آرام نہ ہو
عقل اسکے راز کو کیا پائے حجت سے سمجھ میں وہ کب آئے — اے دوست تری اس حکمت کا میرا سا کہیں انجام نہو
ملحوظ تجھے مرنا ہے اگر جور و ستم بیجا سے گزر — ڈرنا ہے اگر اُس وقت سے ڈر جب مجھ کہ کوئی ناکام نہو

اس عشق میں سب کچھ کھو کر بھی تسنیم بُرے کہلائے ہم
نامی سے کوئی نسبت پا کر اس طرح کبھی بدنام نہو

سید سرفراز حسین (بی۔اے)

عطر حنا ایک عجیب چیز ہے

ظہیر الدین محمدؐ بابر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے بابر کے عہد تک نسطورین پادریوں کے ایجاد کردہ حروف تہجی کا استعمال ہوتا رہا لیکن بابر نے خود تحریر کا ایک جدید طریقہ ایجاد کر کے رائج کیا جسے خط بابری کہتے ہیں۔ بابر اکثر اپنے اشعار کی نقلیں کاپی نویسوں سے لکھوا کر بڑے بڑے امرا کو تحفتہً بھیجا کرتا تھا۔ وہ خود انشا پردازی میں صحت لفظی و معنوی کا بڑا لحاظ کرنے والا تھا۔ ایک موقع پر اپنے خلف اکبر ہمایوں کو جو اس زمانہ میں کابل کا حکمران تھا نہایت معقولیت اور زور کے ساتھ بعض علمی غلطیوں پر چشم نمائی کرتا ہے "تم نے اپنی تحریر میں جو غریب الفاظ استعمال کئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمھارا اصل مطلب خبط ہو گیا۔ اگرچہ تمھارا املا خراب نہیں ہے تاہم بالکل صحیح بھی نہیں ہے۔ انشا پردازی میں تم نے یقیناً کوئی کمال حاصل نہیں کیا۔ آئندہ سے تمھاری خطوط نگاری میں آورد نہ ہونا چاہئے نہایت صاف اور آسان الفاظ تحریر میں لایا کرو تاکہ لکھنے اور پڑھنے والے دونوں کو دقت نہ اوٹھانی پڑے۔"

نہایت تکلیف کی حالت میں شروع شروع اُس نے یہ مطلع کہا ہے ؎ کیا اس شخص کو جو تجھے ضرر پہونچاتا ہے تو تقدیر کے حوالہ کرتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یاد رکھ کہ تقدیر مثل ایک خادم کے ہے اور یہ خادم بغیر انتقام لئے ہوئے تجھے بھی نہ چھوڑے گا۔

اور اس کے بعد کہتا ہے ؎ اگر تیغ عالم بجنبد ز جای نبرور گے تا نخواہد خدای اپنی روح کے سوا اس دنیا میں مینے کسی کو وفادار دوست نہ پایا اور سوا اپنے دل کے مجھے کوئی ایسا قابل اعتماد نہ ملا جسپر بھروسہ کرتا۔ جس زمانہ کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا گیا ہے وہ بابر کے بدنصیبی کا زمانہ تھا۔ فرغانہ اور سمرقند اس کے قبضہ سے نکل چکے تھے۔

قریب ایکسو چالیس برس تک سمرقند میرے خاندان کا دار الحکومت رہا ہے ایک اجنبی قزاق جسے کوئی نہیں جانتا تھا کہ کہاں سے آ گیا تھا سلطنت پر قابض ہو گیا اور وہ ہمارے ہاتھ سے جاتی رہی۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اب پھر میرا تخت و تاراج شدہ ملک دیا"، سمرقند ایک زبردست طول طویل مقابلہ کے بعد اسکے قبضہ سے نکلا تھا ہماری حالت اس شعر کے

ملہ یہ اجنبی ڈاکو چنگیز خاں کی نسل سے تھا اور اس لئے وہ بابر کا بھی رشتہ دار کہا جا سکتا ہے جو مغلوں کا دوست نہ تھا بلکہ اپنا شمار ترکوں میں کرتا تھا۔ بابر نے تزک میں اپنے دونوں حریفوں شیبانی اور خسرو شاہ کا نہایت ناانصافی کے ساتھ ذکر کیا ہے شیبانی خاں ایک دلیر اور فہمند سپاہی ہونے کے علاوہ ایک شاعر اور عربی، ترکی اور فارسی زبان کا عالم تھا اُس نے محبت سے مدرسے اور مساجد تعمیر کئے تھے علما اور فضلا کا بڑا مربی اور سرپرست تھا۔
مؤلف

نگارخانہ صفدر علی محمد علی تاجر عطر چوک لکھنؤ سے طلب کیجئے

مصداق تھی جب ہم نے معاملات میں عجلت کر کے فوراً جنگ شروع کر دی"۔

بہ تندی سبک دست بردن بہ تیغ　　بدنداں گزد پشت دست دریغ

"سرگرمی کے ساتھ جنگ میں مصروف ہونے کا خاص سبب یہ تھا کہ اُس روز "آٹھ ستارے" ٹھیک دونوں فوج کے وسط میں آ گئے تھے، اور اگر وہ دن یوں ہی بیکار چھوڑ دیا جاتا تو وہ ہمارے دشمن کے حق میں فال نیک ہوتا" اور اپنی آخری عمر کے تجربے سے وہ کہتا ہے:۔ "یہ پابندی نہایت لغو تھی اور میری عجلت کے لئے کوئی معقول وجہ نہ تھی"۔

اس لڑائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس کا ملک دوبارہ اس کے قبضہ سے نکل گیا۔ لیکن اس نے اپنی اوہام پرستی کو ترک نہیں کیا آخری زمانہ میں اُس نے ہندستان پر فوجکشی سے انکار کر کے حسب ذیل وجوہ بیان کئے ہیں جو نہایت پیچیدہ انداز میں بیان کئے گئے اور قابل ملاحظہ ہیں۔ "اگر میں اسی سنیچر کو جنگ شروع کر دیتا تو ممکن تھا کہ مجھے فتح حاصل ہو جاتی لیکن مجھے یاد آ گیا کہ سال گزشتہ میں میں نے نوروز کو جو شنبہ کو ہوا تھا کوچ کیا تھا اور اپنے دشمن کو سنیچر کے روز شکست دی تھی۔ امسال ہمنے نوروز کو کوچ کیا جو چہارشنبہ کو واقع ہوا۔ اس لحاظ سے اگر ہم دشمن کو بروز یکشنبہ شکست دیں تو یہ ایک عجیب و غریب، مطابقت ہوگی اس وجہ سے میں نے اپنی فوج کو کوچ نہیں کرنے دیا"!

اب میں اُن واقعات کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو موجودہ زمانہ میں بابر کی تاریخ میں حل طلب معمہ ہیں اور آئندہ بھی رہینگے ہم دیکھیں گے کہ بابر کو صاف گوئی کی بڑی جرارت تھی اسکو اپنی غلطیوں کے اقرار کرنے کا کوئی خوف نہ تھا اور نہ وہ اس کی اصلاح کرنے پر نارضامند تھا۔ فن شاعری کی ترکیبات سے بھی وہ ماہر تھا لیکن اس کی سرگذشت کی شاعرانہ قوت کا اصلی جوہر اس کی عبارت کی سادگی اور اس کی آمد کی روانی ہے اور اس کی سرگزشت میں ۱۵۲۹ء یعنی وفات سے ایک برس پہلے تک کے حالات جمع ہیں ان واقعات پر لحاظ کر کے یہ بات ہمکو بہت زیادہ حیرت میں ڈالتی ہے کہ دو مقامات پر واقعات کا سلسلہ یکبارگی شکست ہو جاتا ہے اور بابر بے انتہا خطرات کے درمیان میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اول ۱۵۰۲ء کے آخر پر جا کر بند ہو جاتا ہے اور پھر واقعات کا پتہ ۱۵۰۴ء تک نہیں چلتا۔

بابر ایک قلعہ کی حفاظت کر رہا ہے۔ اس کے ہمراہ بمشکل سو سپاہیوں سے زاید ہوں گے۔ دشمن آ جاتا ہے اور بعد ایک خونریز لڑائی کے بابر قریب کے پھاٹک سے نکلکر فرار ہو جانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس نہایت پرجوش لڑائی کا جو دست بدست ہو رہی تھی ہر واقعہ بہت مشرح بیان کیا گیا ہے حتیٰ کہ ان تیروں کا شمار بھی درج ہے جو بابر نے چلائے تھے۔ "ایک سوار میرے پاس سے گذرا جو شہر کے ایک تنگ راستہ سے بھاگ رہا تھا میں نے تلوار کی نوک سے اس کی کنپٹی میں ایک ایسی ضرب لگائی کہ وہ جھک گیا اور قریب تھا کہ گھوڑے سے نیچے آ جائے لیکن گلی کی دیوار سے سہارا پکڑ کر وہ سنبھل گیا۔ اپنی جگہ پر قائم رہا اور نہایت خطرناک حالت میں نکل بھاگا"۔ اس قسم کی مقابلہ کی لڑائی سے بابر بچتا اور کھلے میدان میں پہونچتا ہے۔ دشمن سرگرمی کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہے ہیں اس کے ساتھی بہت جلد صرف آٹھ رہگئے اور پھر بابر بھی اکیلا ہی رہگیا۔ وہ بھاگتا ہے اور آخر کار

اصغر علی محمد علی تاجر عطر کو ایک سو سال کے ہوئے

صرف دو دشمن اس ہر کر قریب پہونچتے ہیں۔ وہ مجھ تک پہونچگئے میرا گھوڑا تھک چلا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ میرے پاس تقریباً بیس تیر باقی رہگئے تھے تعاقب کرنے والے مجھ سے ایک تیر کے فاصلہ سے زیادہ قریب نہیں پہونچے لیکن وہ برابر میرا پیچھا کرتے چلے آتے تھے۔ بابر ظہر کے وقت سے پہلے بھاگا تھا اور اب غروب آفتاب کا وقت آگیا۔ دشمنوں نے اُسے پکارا۔ مگر وہ برابر گھوڑا دوڑائے چلا گیا یہاں تک کہ عشا کا وقت آگیا اور ایک مقام پر پہونچکر اس کا گھوڑا آگے نہ بڑھ سکا اس کے تعاقب کنندوں نے کلام پاک کی قسم کھائی اور بابر کو یقین دلایا کہ وہ لوگ اوسے کوئی مضرت پہونچانا نہیں چاہتے بابر نے اُنھیں مجبور کیا کہ وہ اس تنگ گھاٹی سے جہاں کہ وہ تھے نکلکر سڑک کی جانب اس کے آگے آگے چلیں، چنانچہ یہ تینوں شخص برابر چلتے رہے۔ اگلے دن وہ چھپے پڑے رہے ان کے پاس کھانے کا سامان نہایت مختصر تھا اور سونے کے لئے بہت تھوڑا سا وقت ان کو ملا تھا۔ آدھی رات کے بعد ایک دشمن پہونچگیا جس نے یہ خبر دی کہ بابر کے خاص حریف کو ان کے چھپنے کا پتہ لگ گیا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے اس کے ساتھ دغا کی ہے" میں سخت اضطراب کی حالت میں تھا۔ موت کے قریب ہونے کے خیال سے زیادہ انسان کے لئے تکلیف دہ دنیا میں اور کوئی خیال نہیں ہے۔ میں نے بآواز بلند کہا مجھ سے سچ کہو اگر واقعی معاملات میری مرضی کے خلاف واقع ہونے والے ہیں تو میں کم سے کم آخری مرتبہ وضو کر لوں مجھکو معلوم ہوتا تھا کہ میری طاقت سلب ہوگئی ہے۔ میں اُٹھا اور باغ کے ایک گوشہ میں چلا گیا۔ میں نے اپنے دل ہی دل میں خیال کیا اور یہ باتیں کرنے لگا کہ اگر انسان سو برس تک زندہ رہے نہیں بلکہ ہزار برس تک تو آخر کار وہ ——" اس طرح پر بیان کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہ سلسلہ پھر دو برس سے پہلے نہیں شروع ہوتا جبکہ بابر کی قسمت نے پوری یاوری کی کیا یہی علمی قابلیت کا نمونہ ہے؟ کیا اسے محض اُنھیں کامیاب سازشوں کے بیان کرنے پر کفایت کرنا چاہئے تھا جن کے ذریعہ سے اس نے خسرو شاہ کو اس کے ملک سے بھگا دیا اور خود اس کی جگہ پر قابض ہوگیا؟ کیا وہ اپنی بندشوں اور جوڑ توڑ کی باتوں پر نادم معلوم ہوتا ہے اور کیا یہی سبب ہے کہ وہ خسرو شاہ کی خصائل کی مذمت کرتا ہے جس کی نسبت اوروں کے خیالات نہایت اچھے ہیں اس کا کوئی حل نہیں ہے

اس کی سرگزشت میں سلسلہ بیان کا پہلا انقطاع ایک اتفاقی امر خیال کر لیا جاتا اگر اسی قسم کا موقع پھر دوسری جگہ ۱۵۰۸ء میں نہ آتا جبکہ بابر کا ساتھ اس کے ہر رتبہ اور درجہ کے رفقا اور نیز اُن مغلوں نے چھوڑ دیا تھا جن کو اس نے خسرو شاہ کی اطاعت سے بہکایا تھا۔ اس دوسرے واقعہ سے بابر نے اپنی جان نہایت وحشیانہ لڑائی و ذاتی بہادری سے چھوڑائی۔ جیسا کہ ہمیں اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے بتلون طبع گروہ نے اپنے سابق حکمرانوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور بابر کے قسمت کے شریک ہوگئے۔ اہل فارس اس کے رفیق بن گئے۔ شہروں کے پھاٹک اس کے لئے کھولدئے گئے اور وہ اب کابل کا حکمراں بن گیا جو ہندوستان میں آنے کے واسطے پہلا زینہ تھا۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے عطر منگائیے

شیبانی جو بابر کا قدیم دشمن تھا اور جس نے ملک سمرقند کو غصب کر لیا تھا اس کا انجام نہایت خراب ہوا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا اور اس کے اعضا مختلف ممالک میں بھیجدیئے گئے اس کے سر میں بھوسہ بھر کر ترکی سلطان کے پاس بمقام قسطنطنیہ بھیجدیا گیا اور اس کی کھوپڑی کو جسمیں طلاکاری کی گئی تھی شاہان فارس نے شراب پینے میں استعمال کیا۔ بابر کے رفقا اہل فارس نے پندرہ ہزار قیدیوں کو تہ تیغ کیا ان میں سے بہت لوگ خود بابر کے قوم کے تھے اور ان کی اس خاقت نے بابر کو اپنے ملک کے فتح کرنے میں کوئی نمایاں مدد نہ دی اگرچہ اس کے صعب سے صعب دشمن ان کی مدد سے مغلوب ہو گئے اور اس طرح پر وہ ہندوستان فتح کرنے کے لئے بالکل آزاد ہو گیا۔ فارس کے ملعون شیعون سے مدد کا لینا ماوراالنہر کے ایک راسخ الاعتقاد ترکی سنی کی نظر میں مستحسن بات کبھی نہیں خیال کیجا سکتی ہرات بھی اس کے دوستون اور عزیزوں کے قبضہ میں آگیا تھا اور بابر عرصہ دراز تک ان کے دربار میں مقیم رہا۔ ہرات میں ایک بڑی دعوت کے موقع پر بابر کو اپنی سادہ مزاجی کے اظہار کا دوسرا اتفاق پیش آگیا جس کا خلاصہ وہ خود یوں لکھتا ہے:" دعوت میں ایک ہنس (مرغ ؟) بریاں میرے سامنے رکھا گیا۔ میں اس کے کاٹنے کی ترکیب سے ناواقف تھا اُسے یوں ہی چھوڑ دیا۔ بدیع الزماں میرزا (خاندان بابر کا سردار) نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا آپ اسے پسند نہیں کرتے۔ میں نے اس سے صاف صاف کہدیا کہ مجھے اس کے کھانے کا طریقہ معلوم نہیں ہو دربار نہایت شائستہ اور ہر قسم کے سامان عیش سے آراستہ تھا اور یہ ایک عظیم الشان دعوت تھی جو بابر کے رشتہ داروں نے اپنے نوجوان عزیز کی خاطر کی تھی اسے ایک ایسی معمولی بات سے ناواقف ہونے کا اقرار کرنے میں کچھ سبکی ہوئی لیکن اسے پچھ پس وپیش نہیں ہوا۔ ہرات یا ہیری جس کو سکندر اعظم کے قدیم یونانی مورخین ایریا کہتے ہیں اس کی دولتمندی کا حال بیان کرنے کے لئے ایک مختصر فقرہ کافی نہیں ہو سکتا بلکہ ایک پورا باب چاہیے چنگیز خاں کے زمانہ میں یہ بہت گنجان شہر تھا جس کی مضافات کی آبادی شامل کر کے کئی لاکھ کی مردم شماری تھی سنہ ۱۲۲۲-۱۲۲۳ء کے محاصرہ اول کے بعد باشندوں کی جان بخشی کی گئی۔ لیکن پھر انکی بغاوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری مرتبہ سات مہینہ تک شہر کا محاصرہ قایم رہا اور ہرات پر قبضہ کر لیا گیا۔ ایک ہفتہ کامل ہرات میں لوٹ مار اور قتل عام کا بازار گرم رہا۔ ایشیائی مورخ بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ دس لاکھ سے زیادہ جانیں ہلاک ہوئیں اصل تعداد جو کچھ بھی ہو مغلوں کی فوج کو جب تک یہ یقین نہ ہو لیا کہ اب ایک متنفس بھی زندہ باقی نہیں ہے خونریزی بند نہیں کی اُن کے چلے جانے کے بعد قریب تین ہزار بدنصیب باشندوں کے اس تباہ حال موقع پر آئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دو ہزار مغلوں کا

ے یہ ترجمہ ہے مولف کی تحریر کا۔ مترجم اس عبارت کا ذمہ دار نہیں ہے جس کے عقیدہ میں کسی کلمہ گو مسلمان پر لعن طعن کرنا ناروا ہے اس موقع پر یا تو مولف نے اپنی ذاتی معلومات پر بھروسہ کر کے دوسروں کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کا فرض ادا کرنا ضروری سمجھا ہے یا اس قسم کی تحریر سے اس مقصد میں ایک قسم کی مدد پہونچانا ہے جو غیر مسلم اقوام کا خاص نصب العین ہے یعنی مسلمانوں میں ایک کو دوسرے سے متنفر کرنا سیاسی اختلافات ملک اور قوم اور فرقے میں نہیں ہوتے لیکن ان کا اثر معتقدات پر نہ ہونا چاہیے۔ ہمایوں اسی بابر کا پوتہ ہے اس نے شاہ طہماسپ سے مدد لیتے وقت کیوں یہی خیال قائم کیا اور اس موقع کا حال لکھتے وقت مولف نے کیوں ذاتی رائے کے اظہار سے گریز کیا؟ مولف

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگانا چاہیے

ایک دستہ واپس آیا اور اس نے ان کو بھی ہلاک کر دیا اور سولہ مصیبت زدہ آدمیوں کے جنھوں نے نالیوں، نہروں اور مسجد کے گنبدوں میں چھپ کر اپنی جان بچائی تھی ایک شخص بھی باقی نہ رہا یہی لوگ بالآخر خوف اور دہشت کی حالت میں اس اُجڑے ہوئے دیار میں جو پہلے بہت بڑا اور خوبصورت شہر تھا آباد ہوئے ان میں چوبیس آدمی قرب وجوار کے مقامات سے آکر شامل ہو گئے اور قریب پندرہ برس تک صرف یہی چالیس آدمی ایشیا کے اس بہترین شہر میں آباد رہے جس کی مردم شماری ایک زمانہ میں لاکھوں تک پہونچتی تھی۔ اغتائی خاں نے قریب ۱۲۳۵ء کے ہرات کی دوبارہ تعمیر کی اور بہت جلد اس کی اگلی شان وشوکت پھر عود کر آئی بابر کے عہد میں ہرات مشرقی ممالک میں بہت ہی شائستہ شہر شمار کیا جاتا تھا۔

ہرات روح ہے اور یہ دنیا محض اس کا جسم ہے اور اگر خراسان کو دنیا کا سینہ کہا جائے تو ہرات کو اس کا دل کہنا روا ہے بابر نے ہرات کے متعلق یوں لکھا ہے۔ ہرات میں ایسے نامور اور ممتاز لوگوں کا مجمع تھا جو قابلیت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے ان میں سے ہر ایک کا یہ قصد اور حوصلہ تھا کہ جس فن کی تحصیل میں وہ مشغول ہے اس کو وہ حد کمال تک پہونچا دے اُنھیں میں سے مولانا عبدالرحمن جامی تھے جو علم معقول ومنقول میں اپنے ہمعصروں میں یکتا و یگانہ روزگار تھے۔ اور ان کا کلام نہایت مشہور ہے اُن کے ذاتی اوصاف ایسے ارفع و اعلیٰ ہیں کہ میں اُن کو قلمبند کرنے سے قاصر ہوں لیکن مجھکو نہایت فکر تھی کہ میں ان کا ذکر خیر کسی موقع پر کروں اس لئے میں نے اُن کے خصائل حمیدہ کا اشارہ ان ناچیز اوراق میں تیمناً اور تبرکاً کر دیا ہے"

بابر کی حسب ذیل رباعی اس موقع پر درج کر دینا نامناسب نہ ہو گا رباعی ؎

درویشاں را اگرچہ نہ از خویشانیم لیک از دل وجان معتقد ایشانیم
دور است مگوی شاہی از درویشی شاہیم ولے بندۂ درویشانیم

باقی ——— باقی

سید عبدالسبحان ناظر

بھاگلپوری ٹسری ریشمی صافے

ٹسری اور ریشمی صافے یا تھان برائے کوٹ، قمیص، شیروانی اعلیٰ درجے کے درکار ہیں تو ہمارے یہاں سے منگا کر استعمال میں لایئے

مولوی کبیر احمد خاں برادرز بھاگلپور سٹی

فکاہات

جنوبی افریقہ میں۔گول میز کانفرنس کیجئے چاہے کوہ ہمالیہ پر بیٹھکر تالیاں بجایئے یہ جو ہندوستان کے تیس بتیس کروڑ انسان "کالا آدمی" ہوچکے سو اب سفید نہیں ہوسکتے۔ یقین نہ ہو تو شریک ہوجایئے وائسرائے کے استقبالی ہجوم میں جمع ہوجائے کسی بازار میں اور مجمع کیجئے کسی ریلوے پلیٹ فارم پر بس ایک انگریز صاحب آئیں گے اور "اے کالا آدمی" کہکر آپ کو ہٹا دیں گے، علیحدہ کردیں گے، نکال دیں گے، اور کبھی آپ کے اوپر سے گھوڑا دوڑا کر منتشر بھی کردیں گے، مگر یہ کبھی نہ کریں گے کہ "کالا آدمی" سمجھکر ریل کا کرایہ، لفافوں کی قیمت، یا مینونسپل ٹیکس آپ سے کم کریں تاکہ اداے محصول میں آپ سفید لوگوں کے برابر نہ ہوجائیں لیکن سوال یہ ہو کہ آخر انگریزوں نے ہندوستانیوں کا تخلص "کالا آدمی" ہی کیوں رکھا ہے گو اس کا جواب قبل ازیں مسیح موعود نے یہ دیا ہے کہ جبکہ ہم ہندوستانی باہمت کے میدان میں انگریز بھائیوں کے مقابلہ سے بھاگ چکے تو اب انگریز ہوگئے "اولی الامر منکم" لہذا اب ان پر کوئی اعتراض نکتہ چینی، سوال تنقید، غرض سب کچھ حرام ہے، لیکن ان تمام وجوہ کو ہم نے رد کردیا اور فکر باقی ہی رہی کہ آخر کالا آدمی کسے کہا جاتا ہے تو ایک علی گڑھی فرمانے لگے :-

کالا آدمی وہ،

جو، کسی عہدہ کا چارج لیتے ہی اپنے ہم قوم ماتحتوں کا گلا کاٹے،

جو، ہندوستانی ہو کر بھی کتا اور میم ساتھ رکھے،

جو، اردو جانتے ہوئے بھی خواہ مخواہ انگریزی بولے اور لکھے،

جو، ایف اے، پاس ہو کر بھی رشوت کے لئے پولیس میں نوکری کرے،

جو، ایل۔ایل۔بی ہو کر مسلمانوں کو مقدمہ بازی میں پھنسائے،

جو، علم دین کی تکمیل کئے بغیر اخبارات میں قرآنی آیات سے بحث کرے،

جو، نظام حیدرآباد کی مخبری کرے،

جو، اپنے گھر میں نااتفاقی کی آگ لگا کر ابن سعود کی اصلاح کو دوڑے،

جو لیڈر بھی ہو اور کونسل کا ممبر بھی،

جو نفس کش صوفی بھی ہو اور موٹا تازہ بھی،

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

جو، قومی جلسوں میں بیٹھکر روتا بھی ہو اور سی، آئی، ڈی، بھی

جو، زنانہ رسالہ کا ایڈیٹر بھی ہو اور بد اطوار بھی

جو، مولانا بھی ہو اور بے نمازی بھی،

غرض کالا آدمی کے اس قدر معنی بیان کرنے پر بھی جب ہمیں یقین نہ آیا تو خدا نے ایک اور غیبی ترکیب سے ہمیں "کالا آدمی" دکھا دیا جو کسی قدر قصہ طلب ہے

وہ جو کہا ہے کہ "پاؤں میرے کو لنگڑا پن نہیں ہے اور ملک خدا کا تنگ نہیں ہے" سو اس خالص فارسی مثل کے موافق ہم "تلاش معاش" میں چلے جا رہے تھے ناگاہ ایک اسٹیشن پر ہماری ریل کھڑی ہو گئی، کیا دیکھتے ہیں کہ چلے آ رہے ہیں، حال یہ کہ تھے تو قوم کے صرف غلام ہندوستانی لیکن محض انگریزی پڑھ لینے کی وجہ سے دماغ آسمان پر اور مزاج عرش پر تھا کوئی چار سو روپیہ کا سوٹ سیاہ بوٹ آنکھوں پر چشمہ اور ہاتھ میں چھڑی مگر آہ کہ چرخ سے تھے تنگ اس لئے ملازم نے بستر رکھدیا تھرڈ کلاس میں اور جب گاڑی روانہ ہونے لگی تو لٹک گئے بیچارے تھرڈ کلاس میں مگر ڈبے میں داخل ہوتے ہی ہم مسافران کو بے تھرڈ کلاس پر گلیڈسٹونی نظر ڈالی اور بیٹھ گئے اور ایک کسان کی کمر سے کمر جوڑا البتہ انداز نشست بتلا رہا تھا کہ سر آسٹن چیمبرلین وزیر خارجہ برطانیہ جمعیتہ الاقوام میں بیٹھے کسی اہم بین الاقوامی معاہدہ کو مرتب فرما رہے ہیں جس میں ہم ایشیا والوں کو ہر طرح ذلیل رکھنے اور ذلیل سمجھنے کی دفعات زیر غور ہیں، نہ رہا گیا تو ان کے ملازم کو علیحدہ بلا کر دریافت کیا کہ آخر یہ حضرت ہیں کون؟ ملازم نے ان کا تعارف جن الفاظ میں کرایا وہ یوں ہے کہ

جناب من تسلیم!

"یہ حضرت یو. پی. کے ایک گاؤں کی پیداوار ہیں، ایف، اے تک اس طرح تعلیم پائی کہ قومی چندہ سے آپ کو تعلیمی وظیفہ ملتا رہا، ایف، اے کے بعد ایک بڑے شخص نے آپ کی سفارش کر دی تو آپ ہو گئے ایک افسر، بس افسری کا ملنا تھا کہ آپ سے باہر ہو گئے، ہندوستانیوں سے بات کرنا ترک کر دیا، سلام کا جواب ایک اُنگلی سے دینے لگے اردو زبان ہمیشہ کھڑی ترچھی، یا آڑی بولتے تھے، نماز کے وقت ٹینس یا کرکٹ کھیلتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ پر قہر الٰہی کا نزول شروع ہوا اور ایک رشوت کے مقدمہ میں آپ تین سال سے برطرف پھر رہے ہیں اور گو آپ ایف اے ہیں لیکن کہیں جگہ نہیں ملتی مجھے صرف ایک مہینہ کیلئے ملازم رکھ لیا ہے تاکہ پردیس گردی میں آپ کی شان قائم رہے"

عطر حنا اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایئے

ان حالات کو سنکر ہمیں ان سے گفتگو کرنے کا بیحد شوق پیدا ہوا مگر ان کی ظاہری اکڑفوں کو تباہ کرنے کی فکر ہوئی خدا کا کرنا ایسا کہ ایک جگہ ریل میں کساں بھائیوں کی غیر معمولی در آمد بر آمد سے آپ تنگ ہو کر ہمارے پاس ہی آ بیٹھے۔ ادہر ہمارے سفر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم سیٹ پر ایک لحاف بچھا لیتے ہیں پھر اس پر آہستہ آہستہ لیٹنا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک تھوڑی دیر میں اس پوری نشست کے اسی طرح مالک بن جاتے ہیں جس طرح یہ انگریز بھائی تجارت کے بہانے رفتہ رفتہ ہر ایشائی ملک کے مختار کل، پھر یہی نہیں کہ صرف سیٹ پر ہی قبضہ کر لیتے ہیں بلکہ ہر بیٹھنے والے کو بد تراز۔ بی۔ اے پاس سمجھتے ہیں اور چہرہ کو اس درجہ غضبناک بنا لیتے ہیں کہ اکثر سر میں درد پیدا ہو جاتا ہے اور آنکھیں پئے بغیر ہی لال رہا کرتی ہیں، اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مارے خوف کے ایک کے اوپر ایک ہو کر تو بیٹھ جاتے ہیں لیکن ہمارے پاس بیٹھنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی اور ہم تمام راستہ آرام سے سوتے چلے جاتے ہیں، لیکن اب جو "مذکورہ بالا" ہمارے بالکل ہی پاس آ بیٹھتے تو جی میں تو آیا کہ آپ کو خیر آبادی شاعر کا یہ مصرع سنا دیں کہ ؎ تم اپنا منھ ادہر کر لو ہم اپنا منھ ادھر کریں" لیکن محض تہذیب کے خیال سے انھیں مرعوب کرنے کی ترکیب یہ نکالی کہ اپنا بکس کھولا اور کوئی دس بارہ اخبار انگریزی زبان کے نکال کر الٹے سیدھے پڑھ ڈالے پھر یہ کیا کہ واٹرمین فونٹین پین نکال کر ذرا ان سے قریب ہو گئے تاکہ یہ ہماری فی البدیہہ انشا پردازی سے ہماری علمی قابلیت کا بھی اندازہ کر لیں یہ کر کے ہم نے فوراً عنوان لکھا، گورنمنٹ ظالم ہے، گورنمنٹ جابر ہے گورنمنٹ کو نکال دو، گورنمنٹ کو قید کرو۔ وغیرہ بس ان عنوانوں کا پڑھنا تھا کہ بھائی صاحب کے حواس جاتے رہے سانس پھول گیا جسم کے بال کھڑے ہو گئے اور گھبرا کر بولے۔ جناب کا نام؟ ہم نے کہا خاکسار نام۔ ضیاء الملک حضور ملا رموزی فاضل الهیات، ندوی، ایم، اے، علیگ۔ آگس کمپٹنٹ نائٹ۔ آنریبل۔ خان بہادر، سر خان صاحب رائے بہادر کے، سی، ایس، آئی، ہز ہائی نس، مہاراجہ اور اعلیٰحضرت، فرمایا یہ نام کے ساتھ اس قدر الفاظ کا کیا مطلب؟ ہم نے کہا جناب یہ تو تھا صرف ہمارا تخلص تو گھبرا کر فرمایا، پھر جناب کا اصل نام؟ ہم نے کہا۔ قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، خلیفۃ المسلمین، مسیح موعود، حکیم الامۃ، رئیس الاحرار مصور فطرت، ترجمان حقیقت خواجہ، علامہ۔ مفتی۔ احمد رموزی۔ قادیانی، دیوبندی، بریلوی، نظامی، قادری چشتی، حنفی، نقشبندی، محدث علی پوری عفا عنہ اور غفرلہٗ فرمایا اس قسم کے نام کس قوم میں ہوتے ہیں؟ ہم نے کہا اس قسم کے نام صرف ہندوستانی مسلمان ہی رکھتے ہیں فرمایا وطن ہم نے کہا وہی جہاں دوست اس لئے دشمن ہو گئے ہیں کہ ہم مشہور و معروف اہل قلم کیوں ہیں؟ فرمایا مشغلہ؟ آہ کہ ان کے اس سوال پر ہماری آنکھوں سے ساون بھادوں کا موسم شروع ہو گیا اور ہم نے کہا کہ حضور مشغلہ یہی کہ تلاش معاش میں نکلے ہیں یہ سنکر آپ بھی آب دیدہ ہو گئے اور فرمایا۔ مولانا میں بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوں، ہم نے کہا کہ آپ انگریزی زبان نہیں جانتے جو نوکری نہیں ملتی۔ فرمایا مولانا آج کل نوکری ملتی ہے سفارش سے نہ انگریزی سے اور سفارش ملتی ہے غلامی، خدمتگاری

صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگائیے

مخبری، جاسوسی، اور رشوت سے، تو ہم نے کہا پھر ٹھہر جائیے آپ بھی آج فیض آباد کے تھرڈ کلاس مسافر خانے میں،

خدا کسی شخص کو جاڑے کے موسم میں فیض آباد نہ لے جائے، کیونکہ یہاں جاڑا قہر خدا بنکر نازل ہوتا ہے ہم نے مسافر خانے کے ایک صوفیانہ گوشہ میں بستر اس طرح بچھا دیا گو یا ہم کہیں کے بڑے ہی تہجد گزار پیر صاحب ہیں اور اب صبح تک ہو حق ہی کرتے رہیں گے ادہر اودھر دیکھا تو کچھ ہندوستانی سادھو مارے جاڑے کے گناہوں کی گٹھریاں بنے پڑے گنگنا رہے تھے جو علامت تھی اس امر کی کہ انہیں سردی ستا رہی ہے مگر افلاس سے ایک ایک لحاف بھی نہیں غرض کوئی دس بجے ہوں گے کہ مسافر خانے کے ایک گوشہ سے آواز آئی ارے مار ڈالا - ارے رحم کیجئے ارے تو بہ ہم سے نہ رہا گیا اور تسبیح بجاتے ہوئے ہو بچے اس طرف کیا دیکھتے ہیں کہ ریلوے پولیس کے خاص الخاص ہندوستانی دار وغاجی ایک برہنہ مسافر کو بے تحاشہ مار رہے ہیں اور وہ کہہ رہا ہے حضور

کان پور کا رہنے والا ہوں، محنت مزدوری ملتی نہیں، بچے بھوکے مرتے ہیں اوڑھنے کو تنا نہیں -
مزدوری کرنے آیا ہوں، جاڑے کی وجہ سے یہاں پڑ گیا ہوں چور نہیں ہوں ڈاکو نہیں ہوں
صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا "

مگر یہ ہندوستانی دار وغاجی اس فریاد کے جواب میں جو کچھ فرما رہے تھے وہ یہ کہ

نائیں نائیں ڈیم کالا آدمی تم چور ہے - چلا جاؤ مسافر خانہ میں سونے کا حکم نائیں -

یہ پہلا موقع تھا جب ہم نے یہ کالا آدمی اپنی آنکھ سے دیکھا، لیکن ساتھ ہی خوف پیدا ہوا کہ اب کہیں ہمارا بستر نہ اٹھایا جائے کیونکہ یہ ہیں پولیس والے اور یوں بھی ان کی ہر حرکت اُلٹی اور قانون کے خلاف ہی ہوا کرتی ہے مثلاً یہ لوگ رات کو رعایا کی نگرانی اور حفاظت یوں کرتے ہیں کہ رعایا کے سوتے ہوئے لوگوں کو اُٹھا کر اپنی حفاظت کراتے ہیں اور صاف صاف کہتے پھرتے ہیں کہ جاگتے رہو ورنہ ہونا یوں چاہئے تھا کہ سوتے رہو مطمئن رہو، آخر بستر اُٹھا کر اسٹیشن کے فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کا رُخ کیا اور سوچا کہ اب یہ مسافرانہ انکسار تو کر و ترک اور بٹھا دو سکہ اپنی علمی وقار کا یہ تہیہ کرکے کھولدیا دروازہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کا، دیکھا کہ ایک سفید آدمی قیمتی کمبلوں میں خواب فرما رہے ہیں یہ دیکھکر غصہ آیا کہ حاکم قوم کے افراد تو یوں آرام کریں اور محکوم یوں جاڑے مریں بس اسی طیش میں ترکیب یہ کی کہ ایک کرسی کو ویٹنگ روم میں اس زور سے گھسیٹا کہ یہ سفید آدمی جھک کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا - کون ہو تم ؟ ہم نے آہستہ سے کہا وہی شرر دہانند والے عبد الرشید، مگر یہ نہ سمجھے اور پھر فرمایا - ول کون ہو تم ؟ تو ہم نے کہا، عربی میں، ضیاء الملک، فارسی میں حضور - اردو میں مُلّا رموزی، انگریزی میں جرنلسٹ - اخبارات میں - موجد گلابی اردو - ریلوں میں مُلا صاحب - غریبوں میں مُلاجی، عوام میں، مولانا - دفتر میں، منشی جی دوستوں میں مُلا - شاگردوں میں - قبلہ، مریدوں میں حضرت - اور گھر میں دہی تنے کے ابا، اس نام کو سنکر رہ گئی حیران تو ہم نے انگریزی میں کہا کہ ہماری تحقیق تو کر و ختم اور اب تم اپنا منھ ادھر کر لو ہم اپنا منھ ادھر کر لیں کیونکہ

گو ہم انگریزی زبان جانتے ہیں اسمیں گفتگو کرنا اپنی مادری زبان کی توہین سمجھتے ہیں تو یہ سفید رنگ والے بولے کہ میں عربی زبان بھی جانتا ہوں انکا یہ کہنا تھا کہ ہمنے فوراً ما بعد شروع کر دیا اور بسوال جرح کہا کہ میرا نام جی ڈی، ربمولڈ ہے، میں اکسفورڈ یونیورسٹی کا ایم۔ ایس، سی ہوں، امریکہ میں اشتہار نویسی کی تعلیم پائی ہے اور پانچ سال سے لنڈن کے مشہور عالم اخبار "ڈیلی میل" کے شعبۂ اشتہارات کا ایجنٹ ہوں میرا مستقر مصر کا دار الحکومت قاہرہ ہی اور اسی لئے میں عربی زبان خوب جانتا ہوں اسپر ہمنے کہا۔ تو آیئے بسم اللہ کیجئے کوئی سوال پھر سنئے اس کا جواب، فرمایا یہاں اسٹیشن پر اسوقت چائے بھی ملیگی یا نہیں، ہمنے کہا یہ تو دریافت کیجئے کسی ریلوے قلی سے ہم سے اگر بات کرنا ہے تو لکھے پڑھے انسان کی سی بات کیجئے، اس پر ربمولڈ مسکرائے مگر مسکرا کر قیامت ہی ڈھائی کہ لگے ہندوستانی سیاسیات کے اہم حصوں پر سوالات کرنے اسوقت خیال پیدا ہوا کہ دیکھو ان انگریزوں کے مذاق کو اور دیکھو ان کی سیاسی اور بین الاقوامی معلومات کو ورنہ اگر ان کی جگہ ہوتے کوئی ہندوستانی بھائی تو اس ملاقات میں یہ کرتے کہ پہلے تو ہمارے نام اور وطن سے لیکر خاندان تک کے حالات دریافت فرماتے پھر غالب و مومن کے چند اردو یا مہمل اشعار پڑھتے گویا آجکل غالب و مومن کے سوا اقبال و حسرت کے اشعار میں کوئی جان ہی نہیں اور اس اشعار بازی کے بعد ہمارے وطن کے کچھ قصے سن لیتے مگر ایک مسٹر ربمولڈ تھے کہ سوائے سیاسیات عالیہ اور بین الاقوامی مسائل اور سوالات کی خرافیات کی طرف رغبت ہی نہیں کرتے تھے تنگ آکر ترکیب یہ کی کہ دو تین لمبی لمبی جمائیاں لیں اور اُن سے کہا کہ قبلہ اب رات کے بارہ بجے ہیں اس لئے اب ع تم اپنا منھ ادھر کرلو ہم اپنا منھ ادھر کرلیں یہ شب بخیر صبح دیکھا سنا جائیگا، مگر وہ کاہیکو باز آتے تھے فوراً سگریٹ پیش فرما دیا اب تو ہم سمجھ گئے کہ ہوئی صبح چار و ناچار جواب دینا شروع کیا مگر چال یہ چل گئے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی خرابیاں گن گن کر سنانا جو شروع کیا تو انگریزی خون میں اشتعال سا ہونے لگا ادھر لحاف کو پاؤں پر ڈالا اور پھر آہستہ سے اُسے گھٹنوں تک لے آئے پھر سینہ تک، اور جب اطمینان ہو گیا کہ لحاف کا اب ایک ہی زینہ باقی رہگیا ہے ادھر ربمولڈ صاحب بھی کچھ خفا ہو کر مضمحل سے ہو رہے ہیں تو ہم نے ایک دم ......
اسپر ربمولڈ بے ساختہ ہنس پڑے اور فرمایا یہ کیا؟ تو ہم نے کہا بس قبلہ اب ع تم اپنا منھ ادھر کرلو ہم اپنا منھ ادھر کرلیں۔

صبح ہوئی تو ملازمت کی درخواست لکھی قابلیت کے سرٹیفکٹ شامل کئے اور بھائی یقین مانئے کہ ایک ایک محکمے اور دفتر میں گئے ہر جگہ یہی جواب ملا کہ دو سال سے تین بی، اے پاس ہمارے ہاں امیدوار ہیں مگر جگہ خالی نہیں اتفاق سے مل گئے ایک گلابی اردو کے قدر دان فرمایا مولانا نوکری ووکری کہاں ملتی ہے فی الحال پان سگریٹ کی دکان لگا لیجئے اللہ رزاق ہے کیونکہ آج ہندوستان کا کوئی شہر نہیں۔ جہاں، کالا آدمی، بی، اے پاس کر کے بھی مارا مارا نہ پھرتا ہو۔ اس لئے عافیت اسی میں ہے کہ تجارت کیجئے جس سے ہم مالدار ہو جائیں گے اور جب مالدار ہو جائیں گے تو بغیر تحقیق قابلیت کونسل کی ممبری کے ووٹ بھی مل جائیں گے،

رموزی

عطر حنا صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا بہت مشہور ہے

معلومات

یورپ پر امریکہ کا قرض

حکومت امریکہ نے دول یورپ کو مہلت دی ہے کہ وہ ۶۲ سال کے عرصہ میں اپنا قرض ادا کردے برطانیہ ۴۶۰۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ کا مقروض ہے اور ۶۲ سال کا سود ۶۵۰۵۹۲۵۰۰۰ پونڈ ہوگا اور اس طرح یہ مجموعی مقدار ۱۱۱۰۵۹۲۵۰۰۰ پونڈ ہوجائیگی

فرانس ۴۰۲۵۰۰۰۰۰۰ پونڈ کا مقروض ہے اور اس کا سود ۲۸۲۲۶۷۵۱۰۴ پونڈ ہوگا گویا برطانوی قرض کی نصف تک پہونچ جائیگا

اٹلی کا قرض برطانیہ کے قرض سے نصف ہے جس کا سود ۳۶۵۶۷۷۵۰۰ پونڈ ہوگا

ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ اسوقت دول یوروپ امریکہ کے کسقدر مقروض ہیں۔

برطانیہ	۱۱۱۰۵۹۲۵۰۰۰	پونڈ	شکوسلوواکیا	۳۲۱۸۱۱۴۳۴	پونڈ
فرانس	۶۸۴۷۶۷۳۱۰۴	"	رومانیہ	۱۱۲۵۰۶۲۶۰	"
اٹلی	۲۴۰۷۶۷۷۵۰۰	"	یوگوسلادیا	۶۵۱۷۷۶۳۵	"
بلجیم	۷۲۷۸۳۰۵۰۰	"	استھونیا	۳۳۳۲۱۱۴۰	"
پولینڈ	۴۳۵۶۸۷۵۵۰	"	فنلینڈ	۲۱۶۹۵۰۵۵	"
			لتھوانیا	۱۴۵۳۱۹۴	"
لیٹویا	۱۳۹۵۸۶۳۵	"	ہنگری	۴۶۹۳۲۴۰	"

ان سب کا مجموعہ ۲۲۱۴۳۵۳۶۹۹۳ پونڈ ہوتا ہے۔

برکات راکفلر

راکفلر نے جو خطیر رقم حفظان صحت کے تدابیر کے لئے وقف کی تھی اس کے متعلق جو بیانات وقف کے مہتمول نے شائع کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۵ء میں ۶۳۰۰۰۰۰ گنی رقم ۷۹ مختلف ممالک میں صرف کی گئی تاکہ تدابیر صحت اور دفع امراض کے لئے عملی قدم اٹھایا جائے۔ اسی سلسلہ میں بہت سے طلبہ کو وظائف دیکر مختلف ممالک میں بھیجا گیا تاکہ حال کے امراض کے متعلق تحقیق کرکے ان کے دفع کرنے کی تدابیر سوچیں۔

نیویارک ٹائمس

تیس سال پیشتر نیویارک ٹائمس کی اشاعت ۹ ہزار روزانہ تھی۔ لیکن اب ۳۷۰۰۰۰ ہے اور ہفتہ وار اڈیشن کی اشاعت ۶۲۵۰۰۰ ہے۔ پہلے اس کے عملہ میں ۳۰۰ آدمی کام کرتے تھے لیکن اب ۳۰۰۰

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایئے

آدمی کام کرتے ہیں اس کی سالانہ آمدنی بھی ایک لاکھ گنی سے ۵۰ لاکھ گنی تک پہونچگئی ہے۔

انڈے کی زردی اور عطر مشہور ہے کہ تیل سے زیادہ کوئی چیز خوشبو کی جذب کرنے والی نہیں ہے اسی لئے تمام عطر تیل کی زمین پر طیار ہوتے ہیں اور پھر مختلف طریقوں سے تیل اور عطر کو جدا کر لیتے ہیں

اب موسیو بیکہ نے ثابت کیا ہے کہ انڈے کی زردی بھی خوشبو کو بالکل تیل کی طرح جذب کر لیتی ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر کسی ایسے مکان میں جہاں خوشبو پھیلی ہوئی ہو انڈے کو رکھدیا جائے تو اس میں خوشبو سرایت کر جائے گی اور اس کا مزہ خراب ہو جائے گا۔

انگلستان کی عورتیں گزشتہ سال انگلستان کی عورتوں کے علمی و عملی انہماک کا پتہ حسب ذیل نقشہ سے چل سکتا ہے:-

بیمار خانوں میں	۶۵۰۰۰	عورتیں کام کرتی تھیں
مدارس میں	۲۸۰۰۰	عورتیں تعلیم دیتی تھیں
خدمت حکومت میں	۱۰۰۰	عورتیں مشغول تھیں
فنون جمیلہ میں	۴۵۰۰	عورتیں ماہر تھیں
تھیٹروں میں	۵۷۰۰	عورتیں تمثیل کا کام کرتی تھیں
صحافت میں	۷۵۰	عورتیں سربرآوردہ تھیں
نامہ نگاری میں	۱۵۰	عورتیں مشغول تھیں
طب میں	۱۶۰	عورتیں ڈاکٹری کی سند حاصل کر چکی تھیں
فن ہندسہ میں	۳۰	عورتیں ماہر تسلیم کی جاتی تھیں

پرنس بسمارک اور ایک لڑکا پرنس بسمارک (جرمنی کا مشہور شخص) جب پیرس پہونچا تو اُسنے امتحان کرنا چاہا کہ دیکھوں فرانس کے لوگوں کو جسقدر ذہین مشہور کیا جاتا ہے اسقدر ہیں بھی کہ نہیں چنانچہ اس نے مزدوروں کے طبقہ سے ایک چھوٹے لڑکے کو اشارہ سے بلایا اور کہا کہ "اگر تم بغیر اس کے کہ پنجوں پر کھڑے ہو اور میرے منھ سے سگار نکال لو تو میں تمھیں دو پونڈ دیتا ہوں" لڑکے نے یہ سنکر کچھ تامل کیا اور بولا کہ "اگر تم بغیر جھکے ہوئے میرے قدموں کو چھو لو تو میں تمھیں چار پونڈ دیتا ہوں"

امریکہ کا ایک مدرسہ کالیفورنیا میں ایک مدرسہ ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں کے مدرس سب منحنی اور ہلکے جسم کے ہیں۔ یہ مدرسہ ایک ایسی عمارت میں قائم کیا گیا ہے جہاں جھولے کے ذریعہ سے چڑھنا پڑتا ہے۔

صفدر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر خریدیے

اور وہ شخص جو ذرا بھی بھاری جسم کا ہو وہاں تک پہونچ نہیں سکتا اس لئے وہاں کوئی ایسا شخص نوکری کے لئے آتا ہی نہیں جو سبک جسم کا نہو

دنیا کی سب سے زیادہ مشکل زبان کہا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ مشکل زبان اُن سُرخ ہندیوں کی ہے جو جنوبی امریکہ کے ایک مقام برازی میں پائے جاتے ہیں مثلاً اگر انھیں اٹھارہ کا عدد ظاہر کرنا ہوگا تو کہیں گے :۔

"شوہوج - ایمیک - واکتلا - موکیمینک - انتا نتلا - ما" ، جس کے لغوی معنی یہ ہوئے کہ میرے دونوں ہات کی انگلیوں میں اپنے ایک پانوں کی انگلیاں شامل کرو اور ان میں تین کا اضافہ کرو۔

اسی طرح مکھن کے لئے ان کے ہاں ایک لفظ ہے جس کا تلفظ اس طرح ہوتا ہے :۔ "واتکیاناماں کوکینجیننیک - کیتھوک"

برج ایفیل پیرس کا برج ایفل اپنی عظمت کے لحاظ سے نہایت مشہور چیز ہے - اس کی طیاری میں سات ہزار ٹن لوہا صرف ہوا ہے - اور پہلی منزل کا وزن ۳۰۰۰ ہزار ٹن ہے - اس وقت اس برج کی طیاری میں ..... ۷ فرانک صرف ہوئے تھے لیکن اگر آج ایسا برج طیار کیا جائے تو اس سے کئی گنا زیادہ صرف ہو۔

اہل سوڈان کی بعض عادتیں ان کے ہاں جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو اس کے اہل وعیال شہر سے باہر دفن کرنے کے لئے جاتے ہیں اور اس سے فارغ ہونے کے بعد لڑکے ایک صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں - پھر ان کو اشارہ کیا جاتا ہے اور وہ گھر کی طرف جاتے ہیں - ان میں سے جو کوئی سب سے پہلے گھر پہونچکر اپنا نیزہ وہاں گاڑ دیتا ہے وہی مالک خیال کیا جاتا ہے

تنگی اور قحط کے زمانہ میں جب کسی شخص کو فاقے ہونے لگتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو معہ اہل وعیال کے مکان کے اندر بند کر لیتا ہے یہاں تک کہ موت آجائے - سوال کرکے کھانا وہ لوگ جانتے ہی نہیں - بیماری و تکلیف میں خواہ کیسی ہی سخت ہو کراہنا یا قلق کیوقت اضطراب ظاہر کرنا اُن کے ہاں سخت معیوب ہے اور جس سے کبھی یہ گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اس پر اور اس کے خاندان پر ہمیشہ لعنت کی جاتی ہے

قتل کرکے بھاگنا وہ جانتے ہی نہیں - اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرتا ہے تو نہایت اطمینان سے وہیں کھڑا رہتا ہے اور اپنے آپ کو آسانی سے سپرد کر دیتا ہے۔

نیاز فتحپوری

نگار مشین پریس میں

لیتھو کا ہر قسم کا کام سادہ اور رنگین ارزاں اور پابندیٔ وقت کے ساتھ ہوتا ہے - ذیل کے پتہ سے خط وکتابت کیجیے :۔

منیجر نگار مشین پریس نظیر آباد لکھنؤ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگایئے